معارف کا زرتعاون

ہندوستان میں سالانہ اسّی روپے

پاکستان میں سالانہ دو سو روپے — فی شمارہ سات روپے

دیگر ممالک میں سالانہ

ہوائی ڈاک بیس پونڈ یا بتیس ڈالر

بحری ڈاک سات پونڈ یا گیارہ ڈالر

پاکستان میں ترسیل زر کا پتہ : حافظ محمد یحییٰ شیرستان بلڈنگ

بالمقابل ایس۔ ایم۔ کالج۔ اسٹریچن روڈ۔ کراچی

• سالانہ چندہ کی رقم منی آرڈر یا بینک ڈرافٹ کے ذریعہ بھیجیں۔ بینک ڈرافٹ درج ذیل نام سے بنوائیں

DARUL MUSANNEFIN SHIBLI ACADEMY
AZAMGARH

• رسالہ ہر ماہ کی ۱۵ تاریخ کو شائع ہوتا ہے۔ اگر کسی مہینہ کے آخر تک رسالہ نہ پہونچے تو اس کی اطلاع اگلے ماہ کے پہلے ہفتہ کے اندر دفتر میں ضرور پہونچ جانی چاہیے۔ اس کے بعد رسالہ بھیجنا ممکن نہ ہوگا۔

• خط و کتابت کرتے وقت رسالہ کے لفافہ کے اوپر درج خریداری نمبر کا حوالہ ضرور دیں۔

• معارف کی ایجنسی کم از کم پانچ پرچوں کی خریداری پر دی جائے گی۔
کمیشن ۲۵٪ ہوگا۔ رقم پیشگی آنی چاہیے۔

جلد ۱۶۷ ماہ محرم الحرام ۱۴۲۲ھ مطابق ماہ اپریل سنہ ۲۰۰۱ء عدد ۴

فہرست مضامین

شذرات

پوری دنیا افغانستان پر طالبان کے قبضے ہی سے برہم تھی، دو چار ملکوں کے سوا کسی نے ان کی حکومت تسلیم نہیں کی، ان پر بندشیں لگائی گئیں، پابندیاں عائد کی گئیں، معاشی دباؤ ڈالے گئے، غرض ہر طرح تنگ کیا گیا مگر طالبان نے اپنی روش نہیں بدلی اور ہر منزل غم سے دامن جھٹک کر گزر گئے، حال میں انہوں نے افغانستان کے صوبہ بامیان میں گوتم بدھ کے مجسمے توڑ کر اپنے مخالفین کو مزید غضبناک کر دیا، سارے ممالک طالبان کو ان کے مذہبی جنون اور بت شکنی کی وجہ سے لعنت ملامت کر رہے ہیں، سلامتی کونسل اپیل کر رہی ہے کہ وہ اپنے ملک کے ثقافتی ورثے اور یادگاروں کو برباد نہ کریں، مسلمان ممالک بھی یہی مطالبہ کر رہے ہیں، ہندوستان کے مسلمان بھی طالبان کی مذمت میں پیش پیش ہیں اور ان کے عمل کو غیر اسلامی، حکمت، تدبر، دور اندیشی اور مذہبی رواداری کے خلاف قرار دے رہے ہیں، مگر طالبان کے نزدیک یہ ان کے ملک کا اندرونی معاملہ ہے، اس لئے وہ بین الاقوامی دباؤ کے سامنے جھکنے کے لئے تیار نہیں، ہندوستان کی بی۔جے۔پی حکومت بھی عالمی برادری کے ساتھ ہے، ۲۵ مارچ کو اس کی مجلس عاملہ کے جلسے میں مجسموں کے انہدام کو قرون وسطیٰ کی بربریت اور طالبان کی بنیاد پرستی کو امن عالم کے لئے بہت بڑا خطرہ اور برصغیر کو غیر مستحکم کرنے کی سازش بتایا گیا اور عالمی برادری سے ان کے خلاف مناسب قدم اٹھانے پر زور دیا گیا۔

اس تحریر کا مقصد طالبان کی حمایت نہیں بلکہ اصول پسند اور ایماندار جماعت کے دوہرے پن، تضاد بیانی اور دوہرے معیار کو دکھانا ہے جس کی وہ عادی ہو گئی ہے، اس نے اپنے جلسوں میں اپنی خود احتسابی کی تجویز منظور کی مگر اس کا احتساب کانگریس، اپوزیشن پارٹیوں اور طالبان کی نذر ہو گیا، وہ بتائے کہ کیا بابری مسجد کا انہدام، فسادات میں مسلمانوں کا قتل عام، ان کی املاک اور مسجدوں کو پھونکنا، کانپور اور دوسری جگہوں میں بھی پی۔اے۔سی کے مظالم، ۵ مارچ کو نئی دہلی میں اقوام متحدہ کے دفتر کے سامنے وشو ہندو پریشد کا قرآن مجید کو اور آندھرا میں انجیل کو جلانا، عیسائیوں کے گرجا تباہ کرنا، پادریوں کو زندہ جلانا قرون وسطیٰ کی وحشت و درندگی ہے یا اکیسویں صدی کی

تہذیب و ثقافت یا قوت و اقتدار کا بے جا استعمال؟ جب ہندوستان نے طالبان کی حکومت کو تسلیم ہی نہیں کیا تو وہ ان سے احتجاج کیوں کر رہا ہے اور جب وہ اپنے ملک میں کسی کی مداخلت پسند نہیں کرتا تو خود کیوں دوسرے ملکوں کے معاملے میں مداخلت کر رہا ہے، اسی لئے بابری مسجد کے انہدام کی مذمت کی قرارداد کویت پارلیمنٹ اور پاکستان کی قومی اسمبلی میں منظور کی گئی تو اس کو ہندوستان کا اندرونی معاملہ کہہ کر مسترد کر دیا گیا تھا، حقیقت یہ ہے کہ آج جو لوگ اسلام اور مسلمان دشمنی میں سرشار ہو کر بودھوں کی حمایت اور ان کی تہذیب اور یادگاروں کے نوحہ خواں بن کر اٹھے ہیں وہ خود ان کے ساتھ ایسی ہی جنونی کارروائی اور بنیاد پرستی کا مظاہرہ کر چکے ہیں، ان کا قتل عام بھی کیا اور انہیں ملک کی سرحدوں کے باہر کر کے چین، جاپان اور کوریا میں پناہ لینے کے لئے مجبور کیا، ان کے معبدوں اور مٹھوں کو توڑ کر ان کی جگہ اپنے مندر بنا لئے۔

سارا ملک طالبان پر اظہار نفریں کر رہا ہے لیکن بی۔جے۔پی ان کے معاملے میں اتنی حساس ہے کہ اس کو ان کے ملک کے اندرونی معاملے میں مداخلت کرنی اور اپنے جلسے میں ان کی دہشت گردی کے خلاف قرارداد منظور کرنی پڑی، مگر قرآن عظیم کی بے حرمتی اور کانپور کے فساد میں پولیس اور پی۔اے۔سی کے ظلم و بربریت کا ذکر تک اس کے جلسے میں نہیں ہوا، سرکاری حکام، حکومت، میڈیا اور سرکاری ادارے اتنے اہم اور حساس واقعے کو چھپا دینا اور اسے غلط اور افواہ قرار دے کر ختم کر دینا چاہتے تھے مگر جب خبر افشا ہو گئی اور مسلمانوں کا ایک وفد وزیر اعظم سے مل کر اس کے خلاف کارروائی کا مطالبہ کرنے لگا تب بھی وہ اسے غلط کہہ کر ٹال دینا چاہتے تھے، لیکن وفد کے باور کرانے پر ان کو واقعہ کی تحقیق اور قصورواروں کو سزا دینے کا وعدہ کرنا پڑا، یہ ہے مسلمانوں کے ساتھ اجودھیا میں مندر کی تعمیر کو قومی جذبات کا معاملہ قرار دینے والے وزیر اعظم کا رویہ کہ ان کے جذبات کے ساتھ کھلواڑ کیا جائے، ان کی مقدس کتاب کی توہین کی جائے اور افغان کے جرم کا بدلہ ان سے لیا جائے تو وزیر اعظم، ان کی حکومت اور سارا پریس بے حس ہو جائے۔

قرآن مجید کا جلایا جانا بی۔جے۔پی کی نظر میں چاہے کتنا ہی معمولی واقعہ ہو اور غالباً اسی لئے اس کی حکومت

اسے نظرانداز کردینا چاہتی تھی لیکن مسلمانوں کے نزدیک خدا کی کتاب اور اس کے رسول کی اہانت سے زیادہ کوئی سنگین معاملہ نہیں ہوسکتا تھا، وہ قرون وسطیٰ یا دور حاضر کی اس بربریت، بنیاد پرستی کے جنون بلکہ دہشت گردی اور غنڈہ گردی کو برداشت نہیں کرسکتے، چنانچہ جیسے ہی یہ خبران کے کانوں میں پڑی وہ تڑپ اٹھے اور وشو ہندو پریشد کی درندگی کے خلاف احتجاج اور مظاہرہ کرنے لگے، جس کے بعد کئی جگہ پُر تشدد واقعات ہوئے مگر وہ کانپور کے بھیانک فساد کے سامنے دب دبا گئے جس کو اس لئے بڑھنے اور پھیلنے دیا گیا کہ تہلکہ ڈاٹ کام سے بی۔ جے۔ پی حکومت کی جو چولیں ہل گئی ہیں اس کی طرف سے توجہ ہٹ جائے، پولیس اور شرپسندوں کو مسلمانوں کا احتجاج اور مظاہرہ گوارا نہیں حالانکہ یہ ان کا جائز اور آئینی حق ہے، چنانچہ جو پولیس قرآن مجید جلائے جانے پر ساکت سکوت تماشا بنی ہوئی تھی وہ کانپور میں مسلمانوں کے لئے قہر مجسم بن گئی، اس نے اور پی۔ اے۔ سی نے جو ظلم ڈھائے اور لوٹ مار کی، اس کی تفصیل اخباروں میں آچکی ہے، وزیر اعلیٰ کی نظر اس بربریت اور غارت گری پر نہیں پڑی مگر ان کو اس میں بین الاقوامی سازش آئی۔ ایس آئی اور ایس۔ آئی۔ ایم کا ہاتھ دکھائی دینے لگا، وہ ہائی کورٹ کے جج سے اگر غیر جانب دارانہ تحقیق کرادیں تو اصل حقیقت سامنے آجائے گی، قیاس آرائی سے فرقہ وارانہ کشیدگی بڑھے گی۔

جناب فضا ابن فیضی مئو کے صنعتی شہر سے تعلق رکھتے ہیں، مگر وہ اپنے طرزِ سخن کی جدت، کلام کی ندرت اور فکر کی تازگی و شادابی کی وجہ سے پوری اردو دنیا میں مقبول ہیں، ان کے نصف درجن سے زیادہ مجموعے چھپے ہیں اور وہ اکثر اصناف سخن پر ماہرانہ قدرت رکھتے ہیں، تاہم ان کی خاطر خواہ پذیرائی نہیں کی گئی، دو سال پہلے غالب اکیڈمی کی اور اب ان کے ہم وطنوں کی نظران پر پڑی ہے ۱۸ مارچ کو سر اقبال پبلک اسکول مئو میں ان کا جشن منایا گیا جس کے زیر اہتمام ایک سمینار اور مشاعرہ راقم کی صدارت میں ہوا، جس میں مئو کے اہل قلم نے مضامین اور شعراء نے اپنا کلام سنا کر لطف اندوز کیا، سر اقبال پبلک اسکول کے ذمہ دار حضرات خصوصاً اس کے روح رواں ڈاکٹر شکیل اعظمی اس کامیاب ادبی تقریب کے انعقاد پر مبارک باد کے مستحق ہیں۔

مقالات

الفاروق ایک مطالعہ

از ضیاء الدین اصلاحی

الفاروق مولانا شبلیؒ کی شہرۂ آفاق تصنیف ہے جس پر ان کو بجا طور سے فخر تھا، اس کی مقبولیت کی بنا پر اس کے کئی اڈیشن نکلے اور متعدد زبانوں میں ترجمے ہوئے۔

مولانا شبلیؒ کی بعض تصانیف کی دھوم طبع ہونے سے پہلے ہی مچ جاتی تھی اور اہل علم اور اصحاب ذوق کو ان کی اشاعت کا انتظار نہایت بے چینی سے رہتا تھا، الفاروق بھی ان کی ایسی ہی تصنیف ہے، اس کے متعلق وہ خود دیباچے میں رقم طراز ہیں:

"الفاروق جس کا غلغلہ وجود میں آنے سے پہلے تمام ہندوستان میں بلند ہوچکا ہے، اول اول اس کا نام زبانوں پر اس تقریب سے آیا کہ المامون طبع اول کے دیباچہ میں ضمناً اس کا ذکر آگیا تھا، اس کے بعد اگرچہ مصنف کی طرف سے بالکل سکوت اختیار کیا گیا تاہم نام میں کچھ ایسی دلچسپی تھی کہ خودبخود پھیلتا گیا، یہاں تک کہ اس کے ابتدائی اجزا ابھی تیار نہیں ہوچکے تھے کہ تمام ملک میں اس سرے سے اس سرے تک الفاروق کا لفظ بچہ بچہ کی زبان پر تھا۔

ادھر کچھ ایسے اسباب پیش آئے کہ الفاروق کا سلسلہ رک گیا اور اس کے بجائے دوسرے دوسرے کام چھڑ گئے، چنانچہ اس اثنا میں متعدد تصنیفیں مصنف کے قلم سے نکلیں اور شایع ہوئیں لیکن جو نگاہیں فاروق اعظم کے کوکبۂ جلال کا انتظار کر رہی تھیں، ان کو کسی دوسرے جلوہ سے

سیری نہیں ہو سکتی تھی [1]

مصنف کے حبیب سے بھی یہ داستان سننے کے لائق ہے، وہ اس شعر سے شروع کرتے ہیں :

اے آتش فراقت دلہا کباب کردہ — سیلاب اشتیاقت جانہا خراب کردہ

الفاروق کی آمد آمد کا آوازہ مدت سے ملک میں بلند تھا، پبلک کا شوق وقت انتظار تھا، خلیفہ ثانی کی لائف کی عظمت و اہمیت علامہ مصنف کے پیش نظر تھی۔۔۔۔ جب یہ سیمائی جلوے محو ہوئے اور صبح کاذب کی دھندلی روشنی کافور ہوگئی تو صبح صادق نور افشاں ہوئی جس نے نگاہوں کو پُر نور اور دماغوں کو روشن کر دیا، ہم بعض مذکورہ بالا کتابیں پڑھ چکے تھے لہٰذا الفاروق کو دیکھ کر ہم نے بے تامل کہا "دیر آید درست آید" اور جب ہم نے اس میں ان کتابوں کے حوالے دیکھے جو قسطنطنیہ میں مصنف کی نظر سے گزری تھیں تو ہماری زبان سے بے اختیار نکلا "دیر آمدہ ز راہ دور آمدہ"۔۔۔۔ حضرت فاروق اعظم کی لائف (جن کا دِرّہ جنرلوں کی شمشیر سے زائد پر اثر اور جن کی سادہ عظمت قیصر و کسریٰ کے جاہ و جلال سے بڑھ کر تھی) شمس العلماء مولانا شبلی نعمانیؒ کے قلم سے نکلے تو کیا اس کا غلغلہ اور انتظار اس سے کم ہو سکتا ہے جو ہم نے اوپر بیان کیا [2]

۱۰ اگست ۱۸۹۴ء کو مولانا نے الفاروق مکمل کرنے کا عزم مصمم کیا اور چار برس کے بعد ۱۸۹۸ء جولائی کو یہ منزل طے ہوئی۔

مجھے مولانا کی اسی مایہ ناز اور مشہور و مقبول کتاب کا تجزیاتی مطالعہ پیش کرنا ہے۔

سب سے پہلے ۔۔۵ صفحے کی اس کتاب کا مقدمہ ہم کو دعوت نظر و تامل دیتا ہے جو اصلاً الفاروق کے ماخذ و مصادر بتانے اور اس کے اصول تصنیف و ترتیب بیان کرنے کے لئے لکھا گیا تھا، تمہید کے ان اٹھارہ صفحات میں فن تاریخ و تذکرہ کے متعلق وہ اصولی باتیں زیر بحث آئی ہیں جن کو الفاروق کی تالیف میں ملحوظ رکھا گیا ہے اس لئے اس سے سرسری گزر جانا مناسب نہیں معلوم ہوتا۔

شروع میں عرب کی اس خاص خصوصیت کا ذکر ہے کہ ان میں بعض خاص باتیں ایسی پائی جاتی تھیں جن کو تاریخی سلسلے سے تعلق تھا اور جو اور قوموں میں نہیں پائی جاتی تھیں مثلاً انساب کا چرچا، ایام العرب اور شاعری اسی لئے جب عرب میں تمدن کا آغاز ہوا تو سب سے پہلے تاریخی تصنیفات وجود میں آئیں [3]

وہ عبید بن شریہ کی کتاب الملوک و اخبار الماضیین کو فن تاریخ کی پہلی تصنیف بتاتے ہیں جو حضرت امیر معاویہؓ (متوفی ۶۰ھ) کے حکم سے کاتبوں اور محرروں نے عبید سے سُن کر قلم بند کی تھیں [4]

خلیفہ منصور عباسی کے لئے محمد بن اسحاق (م ۱۵۱ھ) نے خاص سیرت نبویؐ پر جو کتاب لکھی تھی مورخین نے اس کو فن تاریخ کی پہلی کتاب مانا ہے مگر مولانا کے نزدیک صحیح یہ ہے کہ اس سے پہلے موسیٰ بن عقبہ (المتوفی ۱۴۱ھ) نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے مغازی قلم بند کئے تھے [5]

یہاں یہ واضح کرنا ضروری ہے کہ الفاروق لکھنے کے زمانے میں وہ کتابیں نہیں چھپی تھیں جن سے معلوم ہوتا ہے کہ موسیٰ بن عقبہ سے پہلے بھی تاریخ و مغازی کی بعض کتابیں لکھی جا چکی تھیں، خود مولانا شبلیؒ نے الفاروق کے کئی برس بعد اپنی شاہکار تصنیف سیرۃ النبی لکھی تو اس کے مقدمہ میں موسیٰ بن عقبہ کے استاد امام زہری (م ۱۲۴ھ) کی مغازی پر ایک مستقل کتاب کا ذکر کیا ہے [6]، اور عروہ بن زبیر (م ۹۴ھ) کے متعلق صاحب کشف الظنون کے حوالے سے تحریر کیا کہ "بعضوں کی رائے ہے کہ فن مغازی کی سب سے پہلی کتاب ان ہی نے تدوین کی ہے" [7]

ابوالاسود محمد بن عبدالرحمٰن بن نوفل (م ۱۳۱ھ یا ۱۳۷ھ) کی مغازی پر ایک کتاب کا ذکر فیوک نے کیا ہے [8]

مولانا نے فن تاریخ کی ترقی و تنزل پر گفتگو کرتے ہوئے بتایا کہ چوتھی صدی ہجری تک ایک دفتر بے پایاں تیار ہوگیا اور کبار مورخین ابو مخنف، کلبی اور واقدی نے نہایت عمدہ اور جدید عنوانوں پر کتابیں لکھیں اور ان میں سے ہر صاحب قلم کا موضوع اور عنوان جدا تھا۔ اس صدی تک آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم اور صحابہ کے حالات میں جن مورخین نے کتابیں لکھی ہیں مولانا نے ان کی تقسیم اس طرح کی ہے

۱۔ وہ جن کی کتابیں ناپید ہوگئیں لیکن ان کا سرمایہ ان کتابوں میں موجود ہے جو اسی زمانے میں یا اس کے بعد قریب تر زمانے میں لکھی گئیں۔

۲۔ جن کی کتابیں آج بھی موجود ہیں اور ان میں سے اکثر کے مطبوعہ یا خطی نسخے مولانا کی نظر سے گزرے تھے۔

مولانا نے دونوں قسم کے مورخین کے سنین وفات درج کرنے اور ان پر مختصر نوٹ لکھنے کا اہتمام کیا ہے تاکہ ان کا اور ان کی تصنیفات کا پایہ معلوم ہوجائے۔ مولانا نے چوتھی صدی ہجری تک کے مورخین کو قدما اور بعد کے مورخین کو متاخرین کا نام دیا ہے اور ان کا نمایاں فرق بھی واضح کیا ہے، مثلاً قدما کی ہر تصنیف نئی معلومات پر مشتمل ہوتی تھی، متاخرین نے اس پر کچھ اضافہ کرنے کے بجائے تغیر اور اختصار کے ساتھ اس کا قالب بدل دیا اور اختصار میں وہی بات چھوڑ دی جو تمام واقعہ کی روح تھی قدما واقعات کو حدیث کی طرح بسند متصل نقل کرتے تھے، متاخرین نے یہ التزام بالکل چھوڑ دیا۔ قدما نے بھی کسی عہد کی معاشرت و تمدن پر جدا عنوان نہیں قائم کئے تھے، لیکن ضمناً وہ جزئیات لکھ دیتے ہیں جن سے تمدن و معاشرت کا کچھ کچھ پتہ چلتا ہے، متاخرین نے یہ خصوصیت بھی قائم نہ رکھی۔

پانچویں صدی کو انھوں نے فن تاریخ کے تنزل کا پہلا قدم قرار دے کر متاخرین میں ابن اثیر، سمعانی، ذہبی، ابوالفدا، نویری اور سیوطی کا نام لے کر لکھا ہے کہ نہایت شہرت حاصل کی مگر تاریخ کے

ساتھ من حیث الفن کوئی احسان نہیں کیا، قدما کی خصوصیات کھودیں اور خود کوئی نئی بات نہیں پیدا کی لیکن ابن خلدون اور ان کے شاگرد مقریزی کو اس عام نکتہ چینی سے مستثنیٰ اور مدح و ستایش کا مستحق بتایا ہے، اول الذکر نے فلسفہ تاریخ کا فن ایجاد کیا جس پر کل قوم ناز کرسکتی ہے۔[۹]

فن تاریخ کی حقیقت و ماہیت اور تاریخ بیان کرتے ہوئے رقم طراز ہیں:

"ان گزشتہ واقعات کا پتہ لگانا اور ان کو اس طرح ترتیب دینا جس سے ظاہر ہو کر ہر موجودہ واقعہ گزشتہ واقعات سے کیونکر پیدا ہوا اسی کا نام تاریخ ہے۔"[۱۰]

اس تعریف کی روشنی میں وہ دو باتوں کو لازمی قرار دیتے ہیں:

۱۔ جس عہد کا حال لکھا جائے، اس زمانے کے ہر قسم کے واقعات لکھے جائیں یعنی تمدن، معاشرت، اخلاق، عادات، مذہب ہر چیز کے متعلق معلومات کا سرمایہ مہیا کیا جائے۔

۲۔ تمام واقعات میں سبب اور مسبب کا سلسلہ تلاش کیا جائے۔

لیکن یہ دونوں چیزیں قدیم تاریخوں میں مفقود ہیں، رعایا کے اخلاق و تمدن اور معاشرت کا سرے سے ذکر نہیں ہوتا، فرماں روائے وقت کے حالات میں فتوحات اور خانہ جنگیوں کے سوا کچھ نہیں ہوتا۔ اسلامی تاریخوں بلکہ ایشیائی تاریخوں کا بھی یہی نقص و انداز ہے مگر مولانا کے نزدیک یہ مقتضائے اسباب اس لئے تھا کہ ایشیا میں ہمیشہ شخصی سلطنتوں کا رواج رہا، واقعات میں سلسلہ اسباب اس لئے نظر انداز ہوا کہ فن تاریخ فلسفہ اور عقلیات سے ناآشنا لوگوں کے ہاتھ میں رہا جن کی نظر فلسفہ تاریخی کے اصول و نتائج پر نہیں پڑی، احادیث و سیر میں روایت کا پلہ درایت پر بھاری رہنے کی وجہ بھی یہی ہے۔ ابن خلدون نے فلسفہ تاریخ کے اصول و آئین منضبط کئے لیکن اس کو اس قدر فرصت نہیں ملی کہ اپنی تاریخ میں اس سے کام لیتا۔[۱۱]

اس فن کے نامکمل رہنے کی وجہ مولانا نے یہ بتائی کہ فن تاریخ میں مذکور واقعات کو مختلف فنون

سے رابطہ ہوتا ہے مثلاً لڑائی کے واقعات فن حرب سے، انتظامی اور قانونی سے، اخلاقی تذکرے علم الاخلاق سے تعلق رکھتے ہیں، مورخ اگر ان تمام امور کا ماہر ہو تو واقعات کو علمی حیثیت سے دیکھ سکتا ہے ورنہ ایک عامی کی طرح اس کی نظر سرسری اور سطحی ہوگی۔ لکھتے ہیں:

"اگر خوش قسمتی سے تاریخ کا فن ان لوگوں کے ہاتھ میں رہا ہوتا جو تاریخ کے ساتھ فن جنگ، اصول قانون، اصول سیاست، علم الاخلاق سے بھی آشنا ہوتے تو آج یہ فن کہاں سے کہاں پہنچا ہوتا"۔[12]

مولانا کے نزدیک سب سے اہم تر بحث یہ ہے کہ جو واقعات مذکور ہیں ان کی صحت کا اعتبار کیسے ہو، واقعات کے جانچنے کے دو طریقوں روایت و درایت پر سیرۃ النبی کے مقدمہ میں زیادہ مفصل بحث کی ہے، یہاں اس پر خاص زور دیا ہے کہ درایت کے اصول اگرچہ موجود تھے، مگر تاریخ میں ان سے بالکل کام نہیں لیا گیا۔[13]

قدیم تاریخوں کے نقائص لکھنے کے بعد الفاروق میں اس کی جس طرح تلافی کی گئی ہے اس کا مفصل بیان ہے مثلاً حضرت عمرؓ کے حالات میں جو مستقل کتابیں لکھی گئیں ان میں ہر قسم کے ضروری واقعات نہیں ملتے، اس لئے ان کے طریق حکومت اور آئین انتظام کے لئے الاحکام السلطانیہ (ابن الوردی) مقدمہ ابن خلدون اور کتاب الخراج (امام ابو یوسف) اور اخبار القضاۃ (محمد بن خلف وکیع) سے خاص صیغہ قضا کے متعلق حضرت عمرؓ کا طریق عمل پیش کیا گیا ہے، ان کی اولیات کی تفصیل کتاب الاوائل (ابو ہلال عسکری) اور محاسن الوسائل الی اخبار الاوائل سے بیان کی گئی ہے، عقد الفرید اور کتاب البیان والتبیین (جاحظ) سے خطبے نقل کئے ہیں، ابن رشیق کی کتاب العمدہ سے حضرت عمرؓ کا شاعرانہ مذاق معلوم کیا گیا ہے، میدانی کی کتاب الامثال سے ان کے حکیمانہ اقوال فراہم کئے ہیں، ابن جوزی کی سیرۃ العمرین سے اخلاق و عادات کی تفصیل لکھی ہے اور شاہ ولی اللہ صاحب کی

ازالۃ الخفاء سے حضرت عمرؓ کی فقہ و اجتہاد پر معلومات اکٹھا کئے ہیں، محب طبری کی ریاض النضرۃ میں حضرت عمرؓ کے حالات بہت تفصیل سے ہیں لیکن مولانا نے دانستہ اس سے احتراز اس لئے کیا ہے کہ اس میں نہایت کثرت سے موضوع اور ضعیف روایتیں ہیں۔[14]

درایت کے منضبط اصول و قاعدے میں سے واقعات کی تحقیق و تنقید کے لئے حسب ذیل کو کارآمد قرار دیا ہے۔

۱۔ واقعہ مذکورہ اصول عادت کے رو سے ممکن ہے یا نہیں؟

۲۔ اس زمانے کے لوگوں کا میلان عام واقعہ کے مخالف تھا یا موافق؟

۳۔ واقعہ اگر کسی حد تک غیر معمولی ہے تو اسی نسبت سے ثبوت کی شہادت قوی ہے یا نہیں؟

۴۔ اس کی تفتیش کہ واقعہ میں راوی کے قیاس اور رائے کا کس قدر حصہ شامل ہے؟

۵۔ واقعہ کی جو صورت راوی نے بیان کی وہ اس کی مکمل تصویر ہے یا اس نے تمام پہلوؤں اور خصوصیتوں پر نظر نہیں ڈالی؟

۶۔ روایت میں زمانے کے امتداد اور مختلف راویوں کے طریقہ ادا سے کیا اور کس قسم کے تغیرات پیدا ہوئے؟[15]

ان اصولوں کی صحت سے کس کو انکار ہوگا، مولانا نے الفاروق میں ان کو برت کر بہت سے مخفی راز معلوم کئے ہیں، موجودہ متداول تاریخوں میں غیر قوموں کی نسبت حضرت عمرؓ کے نہایت سخت احکام منقول ہیں، اس سلسلے میں وہ دو باتیں مدنظر رکھنے پر زور دیتے ہیں۔

یہ تصنیفات اس زمانے کی ہیں جب مسلمانوں میں تعصب پیدا ہوگیا تھا، دوسرے یہ کہ قدیم ترین تصنیفات میں اس قسم کے واقعات بالکل نہیں ہیں یا بہت کم ہیں، اس سے معلوم ہوتا ہے کہ جس قدر تعصب آتا گیا اسی قدر روایتیں خود بخود تعصب کے سانچے میں ڈھلتی گئیں مثلاً تمام

تاریخوں میں مذکور ہے کہ حضرت عمرؓ نے حکم دیا تھا کہ عیسائی کسی وقت اور کبھی ناقوس نہ بجانے پائیں لیکن قدیم کتابوں (کتاب الخراج، تاریخ طبری وغیرہ) میں یہ روایت اس قید کے ساتھ منقول ہے کہ جس وقت مسلمان نماز پڑھتے ہوں اس وقت عیسائی ناقوس نہ بجائیں[16]

ابن اثیر وغیرہ نے لکھا ہے کہ حضرت عمرؓ نے حکم دیا تھا کہ قبیلہ تغلب کے عیسائی اپنے بچوں کو اصطباغ نہ دینے پائیں، لیکن یہی روایت تاریخ طبری میں اس طرح ہے کہ اسلام قبول کر لینے والوں کے بچوں کو زبردستی اصطباغ نہ دیا جائے[17]

یہ نکتہ بھی بتایا کہ جو روایتیں تاریخی ہونے کے ساتھ مذہبی حیثیت بھی رکھتی ہیں جس قدر ان میں تنقید ہوتی گئی ہے اسی قدر مشتبہ اور مشکوک باتیں کم ہوتی گئیں ہیں مثلاً فدک، قرطاس اور سقیفہ بنی ساعدہ کے واقعات ابن عساکر، ابن سعد، بیہقی، مسلم، بخاری سب نے نقل کئے ہیں لیکن جس قدر ان بزرگوں کے اصول اور شدت احتیاط میں فرق مراتب ہے، اسی نسبت سے روایتوں میں مشتبہ اور نزاع انگیز الفاظ کم ہوتے گئے ہیں، یہاں تک کہ خود مسلم و بخاری میں فرق مراتب کا یہ اثر موجود ہے[18]

اصول عقلی کی بنا پر بھی مختلف قسم کے واقعات میں صحت و اعتبار کے مدارج مختلف بتائے ہیں مثلاً حضرت عمرؓ کی خلافت کے واقعات سو برس کے بعد تحریر کئے گئے اس بنا پر معرکوں کی نہایت جزئی تفصیلیں مثلاً صف آرائی کی کیفیت، فریقین کے سوال و جواب، ایک ایک بہادر کی معرکہ آرائی، پہلوانوں کے داؤں پیچ کا رتبہ یقین تک نہیں پہنچ سکتا لیکن انتظامی امور اور قواعد حکومت مدت تک چونکہ محسوس صورت میں موجود رہے اس لئے ان کی نسبت جو واقعات منقول ہیں وہ بے شبہ یقین کے لائق ہیں۔

مولانا کے نزدیک خطبوں اور حکمت آمیز مقولوں میں جو فقرے زیادہ پُر اثر اور فصیح و بلیغ ہیں وہ ضرور صحیح ہیں کیونکہ یہ ضرور محفوظ رہ جاتے ہیں اور ان کا مدت تک چرچا رہتا ہے، اسی طرح احکام شرعیہ سے متعلق خطبوں کے فقرے بھی ضرور قابل اعتماد ہیں کیونکہ فقیہ کی حیثیت سے لوگ ان کو محفوظ

رکھتے ہیں[19]

اس امر کا ذکر بھی کیا ہے کہ اس زمانے کے مذاق کے لحاظ سے جو واقعات چنداں قابل ذکر نہ تھے اور باوجود اس کے ان کا ذکر آ جاتا ہے، ان کی نسبت سمجھنا چاہئے کہ اصل واقعہ اس سے زیادہ ہوگا مثلاً رزم و بزم کی معرکہ آرائیوں اور رنگینیوں کے مقابلے میں مورخین انتظامی امور کے بیان کرنے کے بالکل عادی نہیں ہیں، بایں ہمہ حضرت عمرؓ کے حال میں عدالت، پولیس، بندوبست اور مردم شماری وغیرہ کا ضمناً جو ذکر آ جاتا ہے وہ جس قدر قلم بند ہوا اس سے بہت زیادہ چھوڑ دیا گیا ہے[20]

مولانا یہ بھی ارشاد فرماتے ہیں کہ اور صحابہ کی نسبت حضرت عمرؓ میں زہد و تقشف، سخت مزاجی اور سخت گیری کے اوصاف زیادہ تھے لیکن ان کی نسبت سینکڑوں روایتوں کو صحیح نہیں خیال کرنا چاہئے کیونکہ یہ عموماً گرمی محفل کا سبب ہوتی تھیں اور عوام ان کو نہایت ذوق سے سنتے تھے اس لئے ان میں خود بخود مبالغہ کا رنگ آ گیا ہے، اسی لئے زیادہ معتبر اور مستند کتابوں میں یہ روایتیں بہت کم پائی جاتی ہیں، الفاروق میں مولانا نے ان کے سلسلے میں بڑی احتیاط کی ہے اور ریاض النضرہ، ابن عساکر اور حلیۃ الاولیا وغیرہ کی روایتوں کو بالکل نظر انداز کیا ہے[21]

مولانا نے آج کل کی اعلا درجہ کی مقبول عام تاریخوں کو فلسفہ اور انشا پردازی سے مرکب بتایا ہے، ان کے نزدیک تاریخ و انشا پردازی کی سرحدیں بالکل جدا جدا ہیں، مورخ کا فرض ہے کہ وہ سادہ واقعہ نگاری کی حد سے تجاوز نہ کرے، یورپ کے ایک بڑے مورخ رنکی کے وہ مداح ہیں کیونکہ اس نے تاریخ میں شاعری سے کام نہیں لیا۔ نہ ملک کا ہمدرد بنا نہ مذہب اور قوم کا طرف دار ہوا کسی واقعہ کے بیان میں یہ پتہ نہیں لگتا کہ وہ کن باتوں سے خوش ہوتا ہے اور اس کا ذاتی اعتقاد کیا ہے[22]

مولانا نے واقعات میں اسباب و علل کے سلسلے پیدا کرنے کی کوشش میں یورپ کی بے اعتدالی سے احتراز کیا ہے، اس میں قیاس و اجتہاد سے چارہ نہیں لیکن اس کو واقعہ میں اس قدر مخلوط نہیں کیا ہے۔

کہ دونوں کو الگ نہ کیا جاسکے، یورپ پر وہ یہ الزام عائد کرتے ہیں کہ واقعہ کو اپنے اجتہاد کے موافق کرنے کے لیے ایسی ترتیب اور انداز سے لکھتے ہیں کہ وہ بالکل ان کے اجتہاد کے قالب میں ڈھل جاتا ہے اور کوئی شخص قیاس و اجتہاد کو واقعہ سے الگ نہیں کرسکتا۔[۲۳]

کتاب کی ترتیب، اس کے اصول تحریر اور حوالے کے متعلق بعض باتیں لکھ کر وہ تمہید کو سات شعروں پر ختم کرتے ہیں جن میں تعلی تو ہے مگر بے جا نہیں، مقدمہ کے اس تجزیہ سے ظاہر ہوا کہ گزشتہ تاریخوں میں موجودہ ذوق و معیار کی اور وہ چیزیں نہیں ملتیں جن کو آج نگاہیں ڈھونڈتی ہیں اس لیے مولانا نے قدما کی معتبر، اعلا درجہ اور اول قسم کی تاریخیں اور جدید تحقیق واقعات کے اصول سے الفاروق کا مصالحہ تیار کیا اور مولانا شروانی کے بقول "قدیم معتبر تاریخیں، جدید تحقیق واقعات کے اصول ان دونوں عنصروں کو ملا کر مولف الفاروق نے ایک تازہ دل فریب شکل پیدا کی ہے جو ایشیا اور یورپ دونوں کے قابو سے فرداً فرداً خارج تھی اور جن کی نسبت خود مولانا نے فخریہ لہجے میں فرمایا ہے ؎

پیکرے تازہ کہ خواہم بہ عزیزاں بنمود — لحظۂ از ذوق خودش نیز تماشا کردم

الفاروق دو حصوں میں منقسم ہے، پہلے حصہ میں حضرت عمرؓ کی ولادت سے وفات تک کے واقعات اور فتوحات ملکی کے حالات ہیں، ہم پہلے اس کا تجزیہ پیش کرتے ہیں اور ضمناً یا الگ سے اس کے بعض اہم مباحث پر نظر بھی ڈالیں گے۔ اس میں سب سے پہلا عنوان "نام و نسب، سن رشد و تربیت" کا ہے، اس کے تحت حضرت عمرؓ کا سلسلہ نسب، ان کی خاندانی عظمت، خاندان کی مذہبی سیادت، جد اعلیٰ عدی اور جد امجد نفیل کے رتبہ، والد خطاب کے خاندان قریش کے ممتاز فرد اور حضرت عمرؓ کے برادر عم زاد زید کا تذکرہ ہے، یہ زید نہایت عالی درجہ اور ان ممتاز بزرگوں میں تھے جنھوں نے رسول اللہ ﷺ کی بعثت سے پہلے بت پرستی ترک کر دی تھی اور اس کو علانیہ برا کہتے تھے۔

پھر ولادت، سن رشد اور ان چیزوں کی تعلیم حاصل کرنے کا ذکر ہے جو اس وقت عرب میں لازمہ شرافت خیال کی جاتی تھی یعنی نسب دانی، سپہ گری، پہلوانی، مقرری (خطابت) اور ضمناً شاعری کے عمدہ ذوق، تجارت کو ذریعہ معاش بنانے اور اس غرض سے دور دور ملکوں کے سفر کا تذکرہ ہے، سفر کے نتیجہ خیز حالات پر افسوس ہے کسی مورخ نے توجہ نہیں کی، مولانا کے خیال میں اسی کی بدولت حضرت عمرؓ میں خودداری، بلند حوصلگی، تجربہ کاری، معاملہ دانی وغیرہ اوصاف اسلام لانے سے قبل ہی پیدا ہوگئے تھے، حضرت عمرؓ کے لکھنا پڑھنا سیکھ لینے کو علامہ بلاذری کے بسند حوالے سے بیان کیا ہے کہ جب آنحضرت ﷺ کی بعثت ہوئی تو قبیلہ قریش میں ۱۷ آدمی لکھنا جانتے تھے ان میں سے ایک عمر بن خطاب تھے۔

گو یہ واقعات کم و بیش دوسری کتابوں میں بھی درج ہیں لیکن مولانا کے انداز بیان اور زور قلم نے جو رنگ بھرا ہے وہ علانیہ سب سے جدا ہوگیا ہے، مثلاً حضرت عمرؓ کے جد اعلیٰ عدی کا ذکر کرتے ہوئے لکھتے ہیں :

"ان صیغوں میں سفارت کے صیغے کے افسر تھے، یعنی قریش کو کسی قبیلے کے ساتھ کوئی ملکی معاملہ پیش آتا تو سفیر بن کر جایا کرتے، اس کے ساتھ منافرہ کے معرکوں میں ثالث بھی یہی ہوا کرتے تھے، عرب میں دستور تھا کہ برابر کے دو رئیسوں میں سے کسی کو افضلیت کا دعویٰ ہوتا تو ایک لایق اور پایہ شناس شخص ثالث مقرر کیا جاتا اور دونوں اس کے سامنے اپنی اپنی ترجیح کے دلائل بیان کرتے، کبھی کبھی ان جھگڑوں کو اس قدر طول ہوتا کہ مہینوں معرکے قائم رہتے، جو لوگ ان معرکوں میں حکم مقرر کیے جاتے ان میں معاملہ فہمی کے علاوہ فصاحت اور زور تقریر کا جوہر بھی درکار ہوتا تھا، یہ دونوں منصب عدی کے خاندان میں نسلاً بعد نسل چلے آتے تھے"۔[۲۴]

اس کے بعد قبول اسلام اور ہجرت کا عنوان آتا ہے، اس میں حضرت عمرؓ کے اسلام لانے کا واقعہ تین صفحوں میں لکھا ہے، اس میں اگرچہ کوئی ندرت نہیں لیکن مولانا کے طریقہ ادا اور اچھوتے انداز بیان نے جو کیفیت و جاذبیت پیدا کی ہے وہ آج بھی لوگوں کو مست اور سرشار کر دینے کے لئے کافی ہے، حضرت عمرؓ جو آیتیں پڑھ کر بے اختیار اشہد ان لا الٰہ الا اللہ واشہد ان محمداً رسول اللہ پکار اٹھے تھے، مولانا شبلی نے ان کو سورہ صف کی بتایا ہے[۲۶]، بعض مورخین نے ان کو دوسری سورہ کی آیتیں بتایا ہے، غالباً مرجوح ہونے کی بنا پر مولانا نے ان اقوال کو نظرانداز کیا ہے۔

پھر حضرت عمرؓ کے ۲۰ آدمیوں کے ہمراہ مدینہ منورہ ہجرت کرنے اور قبا یعنی عوالی میں رفاعہ بن منذر کے یہاں قیام کرنے کا ذکر ہے، جب آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے مہاجرین کے رہنے سہنے کے انتظام کے خیال سے انصار سے ان کی مواخات قائم کی تو حضرت عمرؓ کو قبیلہ بنو سالم کے سردار عتبان بن مالک کا بھائی بنایا، یہ ابن ہشام نے لکھا ہے مگر حافظ ابن حجر نے فتح الباری میں ان کے بجائے اوس بن خولی کا نام لکھا ہے اور اسی کو صحیح قرار دیا ہے لیکن مولانا کو اس پر اس لئے تعجب ہوا کہ خود حافظ موصوف نے اصابہ میں ابن سعد کے حوالے سے عتبان ہی کا نام لکھا ہے اوس بن خولی کا جہاں حال لکھا ہے حضرت عمرؓ کی اخوت کا کچھ ذکر نہیں کیا ہے[۲۷]۔

اسی عنوان کے تحت حضرت عمرؓ کی رائے کے موافق اذان کا طریقہ قائم ہونے کا بیان ہے[۲۸]۔

ص ۴۳ تا ۵۸ میں سنہ ہجری سے وفات نبویؐ کے واقعات و حالات بیان کئے گئے ہیں جن میں اہم غزوات ہیں، یہ واقعات و حالات دراصل سیرت نبویؐ کے اجزا ہیں اس لئے مصنف نے اس کو پوری تفصیل سے نہیں لکھا، البتہ جن واقعات میں حضرت عمرؓ کا خاص حصہ ہے ان کو کسی قدر تفصیل سے لکھا ہے، ان کو اس کا احساس ہے کہ اس طرح اگرچہ حضرت عمرؓ کے کارنامے

نمایاں ہو کر نظر نہ آئیں گے کیونکہ جب تک واقعہ کی پوری تصویر نہ دکھائی جائے اس کی اصلی شان قائم نہیں رہتی مگر اس کے سوا اور کوئی تدبیر نہ تھی[۲۹]۔

ان اوراق کے جن اہم مندرجات کی طرف ناظرین کی توجہ مبذول کرانا مناسب ہوگا وہ یہ ہیں:

۱۔ حضرت عمرؓ معرکہ بدر میں رائے و تدبیر، جاں بازی و پامردی کے لحاظ سے ہر موقع پر رسول اللہؐ کے دست و بازو رہے لیکن مولانا نے ان کی شرکت کی مخصوص خصوصیات یہ بیان کی ہیں۔

۱۔ قریش کے تمام قبائل اس معرکہ میں آئے لیکن بنو عدی یعنی حضرت عمرؓ کے قبیلے میں سے ایک متنفس بھی شریک جنگ نہیں ہوا اور یہ امر جہاں تک قیاس کیا جا سکتا ہے صرف حضرت عمرؓ کے رعب داب کا اثر تھا۔

۲۔ حضرت عمرؓ کے ساتھ ان کے قبیلہ اور حلفاء کے ۱۲ آدمی شریک جنگ (مولانا نے ان سب کے نام لکھے ہیں)

۳۔ سب سے پہلے جو شخص اس معرکہ میں شہید ہوا وہ مہجع حضرت عمرؓ کا غلام تھا۔

۴۔ عاصی بن ہشام بن مغیرہ جو قریش کا ایک معزز سردار اور حضرت عمرؓ کا ماموں تھا حضرت عمرؓ کے ہاتھ سے مارا گیا۔ یہ بات ان کی خصوصیات میں شمار کی گئی کہ اسلام کے معاملات میں قرابت اور محبت کا اثر ان پر کبھی غالب نہیں آ سکتا تھا، چنانچہ یہ واقعہ اس کی پہلی مثال ہے[۳۰]۔

مولانا نے آگے قیدیوں کے معاملے میں حضرت عمرؓ کی رائے کے موافق وحی الٰہی نازل ہونے کا ذکر کیا ہے[۳۱] مگر اس کو ان مخصوص خصوصیات میں محسوب نہیں کیا ہے۔

۲۔ جنگ احد میں فتح کے بعد مسلمانوں کے مال غنیمت پر ٹوٹ پڑنے اور خالد کے جو اس وقت اسلام نہیں لائے تھے دفعتاً عقب سے حملہ کر دینے سے نقشہ جنگ تبدیل ہو گیا اور یہ غل پڑ گیا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم مارے گئے، اس سراسیمگی اور برہمی کی حالت میں جو جاں نثار جنگ میدان سے

نہیں ہٹے، ان میں حضرت عمرؓ بھی تھے، مولانا کے نزدیک تمام روایتوں سے یہ امر ثابت ہے اس کی تائید میں طبری اور سیرت ابن ہشام کے الفاظ بھی نقل کئے ہیں۔ اس کے بعد علامہ بلاذری کی انساب الاشراف سے یہ لکھا کہ حضرت عمرؓ ان لوگوں میں تھے جو احد کے دن بھاگ گئے تھے لیکن خدا نے ان کو معاف کر دیا۔ علامہ کی ایک اور روایت میں بھی حضرت عمرؓ کے ثابت قدم نہ رہنے کا ذکر ہے، مولانا شبلی نے اس روایت کو درایتاً غلط بتا کر اصول روایت کے لحاظ سے بھی اسے ناقابل اعتبار قرار دیا ہے کیونکہ اس کی سند کے دو راوی مجہول الحال ہیں، علاوہ ازیں تمام روایتیں اس کے خلاف ہیں۔[۳۲]

صلح حدیبیہ میں معاہدہ کی شرائط پر حضرت عمرؓ کو سخت خلش تھی، اس بارے میں رسول اللہ ﷺ سے ان کے سوال و جواب کا ذکر کرنے کے بعد مولانا کا یہ تحریر فرمانا قابل توجہ ہے:

"حضرت عمرؓ کی یہ گفتگو اور خصوصاً انداز گفتگو اگرچہ خلاف ادب تھا چنانچہ بعد میں ان کو سخت ندامت ہوئی اور اس کے کفارہ کے لئے روزے رکھے، نفلیں پڑھیں، خیرات دی، غلام آزاد کئے تاہم سوال و جواب کی اصل بنا اس نکتہ پر تھی کہ رسول اللہ کے کون سے افعال انسانی حیثیت سے تعلق رکھتے ہیں اور کون سے رسالت کے منصب سے چنانچہ اس کی مفصل بحث کتاب کے دوسرے حصہ میں آئے گی۔"[۳۳]

خیبر کی فتح کے بعد جب اس کی زمین رسول اللہ ﷺ نے مجاہدوں کو تقسیم کی تو ایک ٹکڑا ثمغ نام کا حضرت عمرؓ کے حصہ میں آیا، انہوں نے اس کو راہ خدا میں وقف کر دیا۔ مولانا فرماتے ہیں کہ اسلام کی تاریخ کا یہ پہلا وقف تھا۔[۳۴]

اس حصہ کی سب سے اہم بحث واقعہ قرطاس ہے جو رسول اللہ ﷺ کی علالت کے زمانے کا ہے اور اس سے حضرت عمرؓ کا خاص تعلق ہے، اس کی تفصیل یہ ہے۔

آپ نے وفات سے تین روز پہلے قلم اور دوات طلب فرمائی اور کہا "میں تمہارے لئے ایسی چیز

لکھوں گا کہ تم آیندہ گمراہ نہ ہو گے" حضرت عمرؓ نے کہا "آپ کو درد کی شدت ہے اور ہمارے لئے قرآن کافی ہے"، بعض حاضرین نے کہا رسول اللہ ﷺ بہکی باتیں کر رہے ہیں (نعوذ باللہ)۔

مولانا نے واقعہ کی سنگینی بیان کرتے ہوئے یہ بھی لکھا ہے کہ بعض روایتوں میں ہے کہ حضرت عمرؓ ہی نے اس ارشاد کو ہذیان سے تعبیر کیا تھا (نعوذ باللہ)۔

مولانا کے خیال میں اصل مسئلہ اس لئے نامنفصل رہا کہ غیر متعلق بحثیں چھڑ گئیں اور اصول درایت سے کام نہیں لیا گیا، اصل غور طلب امر یہ ہے کہ جو واقعہ جس طریقہ سے روایتوں میں منقول ہے اس سے کسی امر پر استناد ہو سکتا ہے یا نہیں؟ مولانا اس معاملے میں مندرجہ ذیل امور و واقعات کو پیش نظر رکھنے پر زور دیتے ہیں:

۱۔ آنحضرت ﷺ کم و بیش ۱۳ دن تک بیمار رہے۔

۲۔ صحیح بخاری و مسلم کی تصریح کے مطابق کاغذ و قلم طلب کرنے کا واقعہ جمعرات کے دن کا ہے چونکہ آنحضرت ﷺ نے دوشنبہ کے دن انتقال فرمایا اس واقعہ کے بعد آنحضور ﷺ چار دن زندہ رہے۔

۳۔ اس تمام مدت بیماری میں آنحضرت ﷺ کی نسبت اور کوئی واقعہ اختلال حواس کا کسی روایت میں کہیں مذکور نہیں۔

۴۔ اس واقعہ کے وقت کثرت سے صحابہ موجود تھے، لیکن یہ حدیث باوجود اس کے کہ بہت سے طریقوں سے مروی ہے (صحیح بخاری میں سات طریقوں سے) بایں ہمہ بجز عبداللہ بن عباسؓ کے اور کسی صحابی سے اس واقعہ کے متعلق ایک حرف بھی منقول نہیں۔

۵۔ عبداللہ بن عباسؓ کی عمر اس وقت صرف ۱۳-۱۴ برس کی تھی۔

۶۔ سب سے بڑھ کر یہ جس وقت کا واقعہ ہے اس موقع پر حضرت عبداللہؓ خود موجود نہ تھے اور یہ معلوم نہیں کہ یہ واقعہ انہوں نے کس سے سنا؟

۷۔ تمام روایتوں میں مذکور ہے کہ آنحضرتؐ نے کاغذ قلم مانگا تو لوگوں نے کہا رسول اللہؐ بہکی ہوئی باتیں کر رہے ہیں۔ اس روایت کی تضعیف کرتے ہوئے یہ نکات تحریر فرماتے ہیں۔

جب اور کوئی واقعہ یا قرینہ آنحضرتؐ کے اختلال حواس کا کہیں کسی روایت میں مذکور نہیں تو صرف اس قدر فرمانے سے کہ "قلم دوات لاؤ" لوگوں کو ہذیان کا خیال کیونکر پیدا ہو سکتا ہے، بالفرض انبیاء سے ہذیان سرزد ہونا ممکن بھی ہو تو اس کے یہ معنی نہیں کہ وہ معمولی بات بھی کہیں تو ہذیان سمجھی جائے وفات کے قریب ایک پیغمبر کے اس بات کے فرمانے میں ہذیان کی کیا بات ہے؟

روایت اگر خوہ مخواہ صحیح سمجھی جائے تب بھی اس قدر بہرحال تسلیم کرنا ہوگا کہ راوی نے روایت میں وہ واقعات چھوڑ دئے ہیں جن سے لوگوں کو یہ خیال پیدا ہوا کہ آنحضرتؐ ہوش میں نہیں ہیں اور بیہوشی کی حالت میں قلم دوات طلب فرما رہے ہیں، پس ایسی روایت سے کسی واقعہ پر کیونکر استدلال ہو سکتا ہے جس میں راوی نے واقعہ کی نہایت ضروری خصوصیتیں چھوڑ دیں۔

روایت پر مولانا کا یہ اعتراض بھی وزن دار ہے کہ اتنے بڑے واقعہ میں تمام صحابہ میں سے حضرت عبداللہ بن عباسؓ اس کے راوی ہیں جن کی عمر اس وقت کل ۱۳-۱۴ برس کی تھی اور سب سے بڑھ کر یہ کہ وہ خود واقعہ کے وقت جب موجود نہ تھے تو روایت کی حیثیت کیا رہ جاتی ہے؟

اپنے اوپر بخاری و مسلم کی حدیث پر شبہ کرنے کا یہ جواب دیا ہے کہ ان کے کسی راوی کی نسبت یہ شبہ کرنا کہ وہ واقعہ کی پوری ہیئت محفوظ نہ رکھ سکا، اس سے کہیں زیادہ آسان ہے کہ رسول اللہؐ کی نسبت ہذیان حضرت عمرؓ کی نسبت گستاخی اور سرکشی کا الزام لگایا جائے۔

یہ پہلو بھی قابل غور بتایا ہے کہ آنحضرتؐ اس واقعہ کے بعد چار دن تک زندہ رہے اور اس اثنا میں وقتاً فوقتاً بہت سی ہدایتیں اور وصیتیں فرمائیں (تو آخر اس اہم واقعہ کا کیوں پھر ذکر نہیں کیا)

اسی موقع کا ایک اور واقعہ یہ ہے کہ حضرت عمرؓ وفات کے وقت تک آنحضرتؐ کی خدمت میں رہے اور ان کو اس کا سخت صدمہ ہوا، عام روایت ہے کہ وہ اس قدر خود رفتہ ہوئے کہ مسجد نبویؐ میں جا کر اعلان کیا کہ جو شخص یہ کہے گا کہ آنحضرتؐ نے وفات پائی اس کو قتل کر ڈالوں گا۔

مولانا کے نزدیک قرائن اس روایت کی تصدیق نہیں کرتے، توجیہ یہ فرماتے ہیں کہ مدینہ میں کثرت سے منافقین کا گروہ موجود تھا جو فتنہ پردازی کے لئے آپؐ کی وفات کا منتظر تھا اس لئے حضرت عمرؓ نے مصلحتاً اس خبر کے پھیلنے سے روکا ہوگا، اسی واقعہ نے روایتوں کے تغیرات سے مختلف صورت اختیار کر لی ہے۔ تاہم وہ فرماتے ہیں صحیح بخاری وغیرہ کی تصریحات ہمارے اس قیاس سے مطابق نہیں ہو سکتیں۔[۳۵]

اس کے بعد "سقیفہ بنی ساعدہ، حضرت ابوبکرؓ کی خلافت اور حضرت عمرؓ کا استخلاف" کا باب شروع ہوتا ہے۔ اس میں عہد صدیقی کے واقعات سے زیادہ تعرض نہیں کیا گیا ہے کیونکہ وہ سیرۃ الصدیق کے عنوان کے تحت آتے ہیں، لیکن سقیفہ بنی ساعدہ میں حضرت عمرؓ کی کارروائی اور اقدامات ایسے تھے کہ ان سے شکوک و شبہات پیدا ہو رہے تھے اس لئے مولانا نے اس کی صحیح نوعیت واضح کی ہے۔

اس واقعہ سے یہ تعجب خیز امر معلوم ہوتا ہے کہ آپؐ کے انتقال کے بعد خلافت کی نزاع پیدا ہو گئی اور جن لوگوں کو رسول اکرمؐ سے عشق و محبت کا دعویٰ تھا وہ آپؐ کو بے گور و کفن چھوڑ کر اس بندوبست میں مصروف ہو گئے کہ مسند حکومت اوروں کے قبضے میں نہ آجائے، اس فعل کی ناگواری اس وقت زیادہ نمایاں ہو جاتی ہے کہ یہ حضرت ابوبکرؓ و عمرؓ سے سرزد ہوا تھا جو آسمان اسلام کے مہر و ماہ تھے اور جن لوگوں کو آنحضرتؐ سے فطری تعلق تھا یعنی حضرت علیؓ و خاندان بنو ہاشم، ان کو آنحضرتؐ کے درد و غم اور تجہیز و تکفین سے ان باتوں کی طرف متوجہ ہونے کی فرصت نہ ملی۔

مولانا کو تسلیم ہے کہ کتب حدیث و سیر سے بظاہر اسی قسم کا خیال پیدا ہوتا ہے لیکن ان کے نزدیک درحقیقت ایسا نہیں ہے، وہ اس کو بھی صحیح نہیں مانتے کہ حضرت ابوبکرؓ و عمرؓ تجہیز و تکفین چھوڑ کر سقیفہ

بنو ساعدہ چلے گئے اور خلافت کے باب میں انصار سے معرکہ آرائی کی اور خلافت کو نہ صرف انصار بلکہ بنو ہاشم اور حضرت علیؓ سے بزور منوانا چاہا جس کو بنو ہاشم نے آسانی سے تسلیم نہیں کیا۔

مولانا نے مسئلہ کی تنقیح کر کے یہ غور طلب باتیں لکھیں۔

۱۔ کیا خلافت کا سوال حضرت عمرؓ وغیرہ نے چھیڑا تھا۔ ۲۔ کیا یہ لوگ خود اپنی خواہش سے سقیفہ بنی ساعدہ میں گئے تھے؟ ۳۔ کیا حضرت علیؓ اور بنو ہاشم خلافت کی فکر سے بالکل فارغ تھے ۴۔ ایسی حالت میں حضرت عمرؓ وغیرہ نے جو کیا وہ کرنا چاہیئے تھا یا نہیں؟

مولانا شبلی نے نہایت مستند کتاب مسند ابو یعلی سے حضرت عمرؓ کا یہ بیان نقل کیا ہے کہ وہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے خانہ مبارک میں بیٹھے تھے کہ ایک آدمی نے ان سے باہر آنے کے لئے کہا، انہوں نے کہا چلو ہٹو ہم لوگ آپؐ کے بندوبست میں مشغول ہیں، اس نے کہا کہ ایک حادثہ پیش آیا ہے، انصار سقیفہ بنی ساعدہ میں اکٹھے ہوئے ہیں جلد پہنچ کر اس کی خبر لو کہیں وہ کوئی ایسی بات نہ کر بیٹھیں جس سے لڑائی چھڑ جائے، اس وقت انہوں نے حضرت ابو بکرؓ سے کہا چلو۔

اس روایت سے پہلے دونوں مسئلے حل ہو گئے، نہ حضرت عمرؓ وغیرہ نے خلافت کی بحث کو چھیڑا اور نہ اپنی خوشی سے سقیفہ بنی ساعدہ کو جانا چاہتے تھے۔

تیسرے سوال کے جواب میں فرماتے ہیں کہ اس وقت جماعت اسلامی تین گروہوں میں منقسم تھی ۱۔ بنو ہاشم: جس میں حضرت علیؓ شامل تھے ۲۔ مہاجرین: جس کے رئیس و افسر حضرت ابو بکرؓ وغیرہ تھے ۳۔ انصار: جن کے شیخ القبیلہ سعد بن عبادہ تھے۔ ان میں سے کوئی گروہ بھی خلافت کے خیال سے خالی نہ تھا، انصار نے تو علانیہ اپنا ارادہ ظاہر کر دیا تھا۔ رہے بنو ہاشم اور حضرت علیؓ تو صحیح بخاری؛ اس کی شرح فتح الباری کی روایتوں سے ثابت ہے کہ حضرت علیؓ امیدوار خلافت تھے اور ان کے حمایتی بنو ہاشم تھے اور جس طرح حضرت عمرؓ وغیرہ آنحضرتؐ کو چھوڑ کر سقیفہ کو چلے

گئے تھے، حضرت علیؓ بھی آنحضرتؐ کے پاس سے چلے آئے تھے اور حضرت فاطمہؓ کے گھر میں بنو ہاشم کا مجمع ہوا تھا، سقیفہ میں حضرت علیؓ کا نہ جانا اس وجہ سے نہ تھا کہ وہ آنحضرتؐ کے غم و الم میں مصروف تھے اور ان کو ایسے پر درد موقع پر خلافت کا خیال نہ آسکتا تھا بلکہ اس کی وجہ یہ تھی کہ سقیفہ میں مہاجرین و انصار جمع تھے اور ان دونوں میں سے کوئی حضرت علیؓ کے دعوے کی تائید نہ کرتا، کیونکہ مہاجرین حضرت ابو بکرؓ کو پیشوا تسلیم کرتے تھے اور انصار کے رئیس سعد بن عبادہ تھے۔

اخیر بحث کے متعلق مولانا نے اصول تمدن کے حوالے سے ثابت کیا ہے کہ جو کچھ ہوا وہ بالکل بجا تھا کیونکہ منافقین مدت سے منتظر تھے کہ رسول اکرمؐ کا سایہ اٹھ جائے تو اسلام کو پامال کر دیں، ایسے نازک وقت میں ضروری تھا کہ جزع فزع اور گریہ وزاری میں مصروف رہنے کے بجائے خلافت کا انتظام کرنا ضروری تھا، اس وقت انصار نے یہ بحث چھیڑ کر حالت کو اور نازک بنا دیا، قریش ان کو بہت حقیر سمجھتے تھے جس کا ثبوت بدر کی جنگ میں مل چکا تھا اور وہی نہیں تمام عرب کو انصار کی متابعت سے انکار ہوتا جس کو صاف ابو بکرؓ نے سقیفہ کے اپنے خطبے میں ظاہر کر دیا تھا، علاوہ ازیں اوس و خزرج میں باہم اتفاق نہ تھا، اس لئے ان کے دعوائے خلافت کو دبانا اور حضرت ابو بکرؓ کو جو سب میں با اثر، تجربہ کار اور معمر بزرگ تھے خلیفہ بنانا بالکل بجا ہوا جس سے ایک اٹھتا ہوا طوفان رک گیا اور سب لوگ مطمئن ہو گئے، صرف بنو ہاشم اپنے ادعا پر رکے رہے اور حضرت فاطمہؓ کے گھر میں وقتاً فوقتاً جمع ہو کر مشورے کرتے رہے، اس کے متعلق مولانا نے مصنف ابن ابی شیبہ اور تاریخ طبری سے یہ روایت نقل کی ہے کہ حضرت عمرؓ نے حضرت فاطمہؓ کے دروازے پر کھڑے ہو کر کہا "اے بنت رسول خدا کی قسم آپ ہم کو سب سے زیادہ محبوب ہیں، تاہم اگر آپ کے ہاں لوگ اسی طرح مجمع کرتے رہے تو میں ان لوگوں کی وجہ سے گھر میں آگ لگا دوں گا"۔

مولانا شبلی کو اس روایت کے رواۃ کا حال معلوم نہیں ہو سکا، اس لئے اصول روایت کے رو سے انہوں نے اس پر گفتگو نہیں کی لیکن از روئے درایت وہ اس کا انکار نہیں کرتے، لکھتے ہیں:

"حضرت عمرؓ کی تندی اور تیز مزاجی سے یہ حرکت کچھ بعید نہیں، حقیقت یہ ہے کہ اس نازک وقت میں حضرت عمرؓ نے نہایت تیزی اور سرگرمی کے ساتھ جو کارروائیاں کیں ان میں گو بعض بے اعتدالیاں پائی جاتی ہوں لیکن یاد رکھنا چاہئے کہ انہی بے اعتدالیوں نے اٹھتے ہوئے فتنوں کو دبا دیا اور بنوہاشم کی سازشیں اگر قائم رہتیں تو اسی وقت جماعت اسلامی کا شیرازہ بکھر جاتا اور وہی خانہ جنگیاں برپا ہو جاتیں جو آگے چل کر جناب امیر علیہ السلام اور امیر معاویہؓ میں واقع ہوئیں۔"[۳۶]

مسلمانوں میں جو لوگ بنوہاشم کی برتری کے قائل ہیں ممکن ہے ان کو مولانا کی یہ رائے پسند نہ آئے مگر ہمارے خیال میں حضرت عمرؓ کی اس طرح کی رائیں ان کے اسلامی جوش اور حمیت حق کا نتیجہ تھیں جو بالکل صحیح تھیں، اسے "حرکت" یا بے اعتدالی پر نہیں محمول کرنا چاہئے اور نہ تندی، تیز مزاجی اور بے اعتدالی قرار دینا چاہئے، وفات نبویؐ کے وقت برافروختہ ہو کر گردن اڑا دینے کی بات کی خود بڑی خوبصورت توجیہ کی ہے، اس لئے سازشوں کے مرکز میں آگ لگا دینے کے اظہار کو بے اعتدالی کہنے کی گنجائش نہیں۔

اس کے بعد "خلافت اور فتوحات" کا عنوان قائم کیا ہے، حضرت ابوبکرؓ کے عہد میں فتوحات ملکی کا آغاز ہو چکا تھا، لیکن عراق و شام میں مہمات کا ابھی آغاز ہی تھا کہ وہ انتقال کر گئے، حضرت عمرؓ نے عنان خلافت ہاتھ میں لی تو سب سے ضروری کام انہی مہمات کا انجام دینا تھا، مولانا نے ان واقعات کی تفصیل لکھنے سے پہلے ۵ صفحوں میں یہ بتانا ضروری سمجھا کہ اسلام سے پہلے عرب کو

فارس و شام سے کیا تعلقات تھے، تاکہ اس تمہیدی بیان سے یہ ظاہر کر دیں کہ حضرت ابوبکرؓ نے جو کام شروع کیا اور حضرت عمرؓ نے جس کی تکمیل کی اس کے کیا اسباب تھے، پھر انہوں نے حضرت عمرؓ کے زمانے میں ہونے والی جنگوں اور ملکوں کی فتوحات کے واقعات تفصیل سے لکھے ہیں جن کا سلسلہ ص۷۲ سے شروع ہو کر ص۱۹۶ تک چلا گیا ہے، ہم پہلے ان کے جلی عنوانات لکھتے ہیں، پھر ان میں بیان کردہ اہم اور توجہ طلب امور اور مولانا کے اخذ کردہ نتائج کو نمایاں کریں گے، ان کے عنوانات یہ ہیں:

فتوحات عراق (ص۷۲ تا ۷۹) واقعہ بویب رمضان (صفحہ ۸۰ تا ۹۳) قادسیہ کی جنگ اور فتح (ص ۹۴ تا ۱۱۰) جلولاء (ص ۱۱۱ تا ۱۱۳) فتوحات شام (ص ۱۱۴) فتح دمشق (ص ۱۱۵ تا ۱۱۶) فحل (۱۱۷ تا ۱۲۰) حمص (۱۲۳ تا ۱۲۵) یرموک (ص ۱۲۶ تا ۱۳۱) بیت المقدس (۱۳۲ تا ۱۳۶) حمص پر عیسائیوں کی دوبارہ کوشش۔ حضرت خالد کا معزول ہونا (ص ۱۵۰-۱۵۲) عمواس کی وبا (۱۵۳-۱۵۶) قیساریہ کی فتح (ص۱۵۷) خوزستان (۱۶۰-۱۶۵) عراق عجم (ص ۱۶۶-۱۷۱) ایران پر عام لشکر کشی (۱۷۲-۱۷۴) آذربائیجان (۱۷۵-۱۷۶) طبرستان (۱۷۷) آرمینیہ (ص۱۷۸) فارس (۱۷۹ تا ۱۸۱) کرمان (ص ۱۸۲) سیستان (ص ۱۸۳) مکران (ص ۱۸۴) خراسان کی فتح اور یزدگرد کی ہزیمت (ص ۱۸۵ تا ۱۸۷) مصر کی فتح (۱۸۸-۱۹۰) اسکندریہ کی فتح (ص ۱۹۱ تا ۱۹۶)

الفاروق میں ان معرکوں کے سنین ہجری و عیسوی عنوان کے ساتھ ہی اور مقامات کے جغرافیائی حالات اور جنگوں کا پس منظر بھی بیان کیا ہے، واقعات کی تفصیل بیان کرتے ہوئے مولانا نے جو تبصرے کئے یا واقعہ کے نتائج پیش کئے ہیں، ذیل میں ان کی بعض مثالیں درج ہیں:

قادسیہ کی جنگ کے سپہ سالار حضرت سعدؓ بن وقاص کو عرق النسا کی شکایت تھی اور چلنے پھرنے سے معذور تھے، وہاں ایک قدیم شاہی محل تھا جو عین میدان کے کنارے پر واقع تھا، حضرت

سعدؓ بالاخانہ پر میدان کی طرف رُخ کر کے تکیہ کے سہارے سے بیٹھے اور خالد بن عرفطہ کو اپنے بجائے سپہ سالار مقرر کیا تاہم فوج کو لڑاتے خود تھے یعنی جو حکم دینا مناسب ہوتا تھا، پرچوں پر لکھ کر اور گولیاں بنا کر خالد کی طرف پھینکتے جاتے تھے اور خالد انہی ہدایتوں کے موافق موقع بہ موقع لڑائی بدلتے جاتے تھے، مولانا اس کی تفصیل بیان کر کے لکھتے ہیں:

"تمدن کے ابتدائی زمانے میں فن جنگ کا اس قدر ترقی کرنا تعجب کے قابل اور عرب کی تیزی طبع اور لیاقت جنگ کی دلیل ہے"۔[۳۷]

مدائن میں حضرت سعد داخل ہوئے ایوان کسریٰ میں تخت شاہی کے بجائے منبر نصب ہوا چنانچہ جمعہ کی نماز اسی میں ادا کی گئی اور یہ پہلا جمعہ تھا جو عراق میں ادا کیا گیا۔ اس کا حال لکھتے ہوئے بے ساختہ مولانا کے قلم سے یہ جملے نکل گئے:

"ہمارے فقہاء کو تعجب ہوگا کہ سعد نے باوجودیکہ اکابر صحابہ میں سے تھے اور برسوں جناب رسالتمآب کی صحبت میں رہے تھے، عالمگیر و محمود کی تقلید نہیں کی بلکہ ایوان میں جس قدر مجسم تصویریں تھیں سب برقرار رہنے دیں"۔

اور حاشیے میں یہ تحریر فرمایا:

"علامہ طبری نے جو بڑے محدث بھی تھے تصریح کے ساتھ اس واقعہ کو لکھا ہے"۔[۳۸]

حضرت سعدؓ نے ایوانات شاہی کا خزانہ اور نادرات لاکر یک جا کرنے کا حکم دیا، نوادر اور اشیا کی تفصیل لکھتے ہوئے یہ موثر باتیں بھی حوالۂ قلم کی ہیں:

"یہ تمام سامان فوج کی غارت گری میں ہاتھ آیا تھا، لیکن اہل فوج ایسے راست باز اور دیانت دار تھے کہ جس نے جو چیز پائی تھی بجنسہٖ لاکر افسر کے پاس حاضر کر دی تھی، چنانچہ جب سب سامان لاکر سجایا گیا اور دور دور تک میدان جگ مگا اٹھا تو خود سعد کو حیرت ہوئی، بار بار تعجب کرتے تھے اور کہتے تھے کہ جن لوگوں نے ان نادرات کو ہاتھ نہیں لگایا بے شبہ انتہا کے دیانت دار ہیں، مال غنیمت حسب قاعدہ فوج میں تقسیم ہو کر پانچواں حصہ دربار خلافت میں بھیجا گیا، فرش اور قدیم یادگاریں بجنسہٖ بھیجی گئیں کہ اہل عرب ایرانیوں کے جاہ و جلال اور اسلام کی فتح و اقبال کا تماشا دیکھیں، حضرت عمرؓ کے سامنے جب یہ سامان چنے گئے تو ان کو بھی فوج کی دیانت اور استغنا پر حیرت ہوئی"۔[۳۹]

مال غنیمت میں سب سے عجیب و غریب ایک فرش تھا جس کو ایرانی بہارؔ کے نام سے پکارتے تھے یہ فرش اس غرض سے تیار کیا گیا تھا کہ جب بہار کا موسم نکل جاتا تھا تو اس پر بیٹھ کر شراب پیتے تھے، اس رعایت سے اس میں بہار کے تمام سامان مہیا کئے تھے، اس کی نسبت لوگوں کی رائے تھی کہ تقسیم نہ کیا جائے، خود حضرت عمرؓ کا منشا بھی یہی تھا لیکن حضرت علیؓ کے اصرار سے اس بہار پر بھی خزاں اور دولت نوشیروانی کے مرقع کے پرزے اُڑ گئے، مولانا اس واقعہ کا تذکرہ کرنے کے بعد لکھتے ہیں:

"یورپ کے موجودہ مذاق کے موافق یہ ایک وحشیانہ حرکت تھی لیکن ہر زمانے کا مذاق جدا ہے، وہ مقدس زمانہ جس میں زخارفِ دنیوی کی عزت نہیں کی جاتی تھی، دنیاوی یادگاروں کی کیا پروا کر سکتا تھا"۔[۴۰]

فتح جلولا کے بیان میں دو باتوں پر نظر ٹھہرتی ہے:

۱۔ اس فتح کا مژدہ دینے کے لئے حضرت سعدؓ نے زیاد کو بھیجا انہوں نے نہایت فصاحت سے جنگ کے حالات بیان کئے، حضرت عمرؓ نے فرمایا کہ ان واقعات کو اسی طرح مجمع عام میں بھی بیان کر سکتے ہو، زیاد نے کہا میں کسی سے مرعوب ہوتا تو آپ سے ہوتا چنانچہ مجمع عام ہوا اور انہوں نے اس فصاحت و بلاغت سے تمام واقعات بیان کئے کہ معرکہ کی تصویر کھینچ دی، حضرت عمرؓ بول

اٹھے کہ خطیب اس کو کہتے ہیں، انہوں نے برجستہ کہا سہ

ان جند نا اطلقونا بالفعال لساننا[۴۱]

۲- زیاد نے غنیمت کا ذخیرہ حاضر کیا، اس وقت شام ہوچکی تھی اس لئے تقسیم ملتوی کا ہی اور صحن مسجد میں ان کا ڈھیر لگا دیا گیا، عبدالرحمن بن عوف اور عبداللہ بن ارقم نے رات بھر پہرہ دیا، صبح کو مجمع عام میں چادر ہٹائی گئی، درہم و دینار کے علاوہ انبار کے انبار جواہرات تھے، حضرت عمرؓ بے ساختہ رو پڑے، لوگوں نے تعجب سے پوچھا کہ یہ رونے کا کیا محل ہے، فرمایا کہ "جہاں دولت کا قدم آتا ہے رشک وحسد بھی ساتھ آتی ہے"۔[۴۲]

(باقی)

حوالے

۱ مولانا شبلی نعمانی: الفاروق۔ دیباچہ ص۱، معارف پریس اعظم گڑھ ۱۹۵۶ء/ ۱۳۷۶ھ ۲ مولانا حبیب الرحمن خاں شروانی: مقالات شروانی ص۳۲ و ۳۳، شروانی پرنٹنگ پریس علی گڑھ ۱۹۴۷ء ۳ مولانا شبلی نعمانی: الفاروق تمہید ص۳، معارف پریس اعظم گڑھ ۱۹۵۶ء/ ۱۳۷۶ھ ۴ ایضاً ص۴ ۵ ایضاً ۶ ایضاً: سیرۃ النبی حصہ اول مقدمہ طبع جدید معارف پریس ۱۹۹۶ء ۷ ایضاً ص۱۸ ۸ معارف اگست ۱۹۸۱ء ص۱۴۷، مضمون ڈاکٹر محمد اجمل اصلاحی ۹ مولانا شبلی نعمانی: الفاروق تمہید ص۶ تا ۹ معارف پریس اعظم گڑھ ۱۹۹۶ء ۱۰ ایضاً ص۹ ۱۱ ایضاً ص۱۰ ۱۲ ایضاً ص۱۱ ۱۳ ایضاً ص۱۲ ۱۴ ایضاً ص۱۳ و ۱۴ ۱۵ ایضاً ص۱۴ اور ۱۵ ۱۶ ایضاً ص۱۵ ۱۷ ایضاً ص۱۸ ۱۸ ایضاً ص۱۹ ۱۹ ایضاً ص۲۶ و ۲۷ ۲۰ ایضاً ص۱۷ ۲۱ ایضاً ص۲۱ ۲۲ ایضاً ص۲۲ ۲۳ ایضاً ص۱۸ ۲۴ ایضاً ص۱۹ ۲۵ مولانا حبیب الرحمن خاں شروانی: مقالات شروانی ص۳۳، شروانی پرنٹنگ پریس علی گڑھ ۱۹۴۷ء ۲۵ مولانا شبلی نعمانی: الفاروق حصہ اول ص۲۱، معارف پریس اعظم گڑھ ۱۹۵۶ء/ ۱۳۷۶ھ ۲۶ ایضاً ص۲۹ ۲۷ ایضاً ص۳۲ ۲۸ ایضاً ص۳۳ ۲۹ ایضاً ص۳۴ ۳۰ ایضاً ص۳۷ ۳۱ ایضاً ص۳۸ ۳۲ ایضاً ص۴۲ و ۴۳ ۳۳ ایضاً ص۴۳ ۳۴ ایضاً ص۵۰ ۳۵ ایضاً ص۵۸ ۳۶ ایضاً ص۹۵ ۳۷ ایضاً ص۷۵ ۳۸ ایضاً ص۹۵ ۳۹ ایضاً ص۱۰۸ و ۱۰۹ ۴۰ ایضاً ص۱۰۹ و ۱۱۰ ۴۱ ایضاً ص۱۱۱ ۴۲ ایضاً ص۱۱۳ ۴۳ ایضاً ص۱۱۳۔

جہانگیر نامہ

دنیا کا ایک قدیم ترین اور نایاب قلمی نسخہ

از ڈاکٹر محمد عتیق الرحمن ٭

خدابخش لائبریری پٹنہ اپنے نادر و نایاب قلمی نسخوں اور مصور و خطی نمونوں کے لئے پوری دنیا میں مشہور ہے۔ خاص طور پر یہاں سلطنت مغلیہ کی کچھ ایسی یادگار قلمی کتابیں محفوظ ہیں جن کی مثال دنیا کی کسی دوسری لائبریری میں نہیں ملتی۔ ان ہی یادگار قلمی کتابوں میں جہانگیر نامہ کا ایک قلمی نسخہ بھی ہے جو خود جہانگیر بادشاہ (۱۰۱۴-۱۰۳۷ھ) کی تصنیف ہے اور جو خدابخش لائبریری میں ہینڈلسٹ نمبر ۱۱۳ کے تحت درج ہے۔ ۱۱۹ اوراق پر مشتمل ہے۔ سائز ½۶ × ۴ انچ ہے۔ اس کے ابتدائی اوراق نہایت خوبصورت اور دلکش رنگین بیل بوٹوں سے آراستہ ہیں۔ اس دور کے معروف کاتب عرب شیرازی نے سنہ ۱۰۲۰ھ میں کتابت کی ہے جو خوبصورت خط نستعلیق میں ہے۔

اہمیت یہ دنیا کا نہایت قدیم اور اہم ترین نسخہ ہے۔ کیونکہ اس کی کتابت سنہ ۱۰۲۰ھ میں ہوئی جو جہانگیر بادشاہ کے عہد حکومت کا چھٹا سال ہے اور جس کا کاتب محمد مومن معروف بہ عرب شیرازی ہے۔ یہ بات ہمیں اس نسخے کے ترقیمہ کی عبارت سے معلوم ہوتی ہے جو یہ ہے:

"بتاریخ یوم الاربعا سلخ ذوالحجہ سنہ ۱۰۲۰ھ در دارالسلطنۃ حیدرآباد مصئونہ عن کل شر و فساد برسم خزانہ کتب اعلی حضرت السلطان الہادی الکامل افتخار السلاطین

٭ خدابخش لائبریری۔ پٹنہ۔

فی الزمان و اشرف الخواقین فی الدوران السلطان ابن السلطان الخاقان بن الخاقان لازالت رایات دولت منصورہ و اعدا حضرت مقھورہ۔ بیدہ الفقیر محمد مومن مشہور بہ عرب شیرازی سمت تحریر یافت۔"

اس کے علاوہ اس نسخے کے ابتدائی صفحہ پر اورنگ زیب عالم گیر بادشاہ کے سب سے بڑے لڑکے محمد سلطان (۱۰۸۷ھ/۱۶۷۶ء) کی ایک خود نوشت تحریر ملتی ہے۔ جس سے واضح ہوتا ہے کہ اس کی کتابت خود جہانگیر نے کرائی تھی جس کو بعد میں محمد سلطان نے گول کنڈہ کے فرمانروا قطب الملک محمد قطب شاہ کے کتب خانہ سے حاصل کیا تھا۔ عبارت یہ ہے:

"ایں کتاب جہانگیر نامہ را کہ حضرت جنت مکانی خود تصنیف نمودہ اند دار الفتح حیدرآباد از کتب خانہ قطب الملک گرفتہ شد۔ حررہ محمد سلطان"

ان دونوں شواہد کی روشنی میں یہ بات پورے وثوق کے ساتھ کہی جا سکتی ہے کہ یہ نسخہ خود جہانگیر کے عہد کی یادگار ہے جس کو اس نے اپنے چھٹے سال جلوس میں خود کتابت کرائی تھی۔

اس کے علاوہ آخری صفحہ پر ایک عرض دیدہ ملتا ہے جس پر ۲۹ ربیع الاول ۱۲۰۸ھ کی تاریخ لکھی ہوئی ہے اس سے بھی اس کی اہمیت و قدامت واضح ہوتی ہے اور اس طرح یہ تمام دیگر قلمی نسخوں میں سب سے زیادہ مستند اور معتبر نسخہ قرار پاتا ہے۔

تاریخی مواد یہ نسخہ گرچہ ۱۰۲۰ھ یعنی جہانگیر بادشاہ کے چھٹے سال جلوس میں لکھا گیا لیکن ہمیں اس میں اس کے صرف تین سال کے حالات و واقعات ملتے ہیں۔ یہ نسخہ ایک خوبصورت مقدمہ سے شروع ہوتا ہے۔ جس میں جہانگیر نے بڑی شگفتہ اور دلکش اسلوب بیان میں اللہ تعالیٰ کی تعریف کی ہے اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم پر درود و سلام بھیجا ہے۔ اس کے بعد تسخیر کائنات اور خلافت ارضی والی آیت اِنِّی جَاعِلٌ فِی الْاَرْضِ خَلِیْفَةً پیش کر کے اپنی ذہنی و فکری بلندی کی

وضاحت کی ہے (یہ مقدمہ بعد میں تحریر کیا جا رہا ہے) مقدمہ کے بعد تخت شاہی پر بیٹھنے اور پھر جشن منانے کو بیان کیا ہے۔ اس کے بعد دیگر متعلقہ واقعات تحریر کئے ہیں۔ اس نسخے کا آخری واقعہ ۲۰ ویں مہینے کا ہے جس میں جہانگیر نے خسرو کی بغاوت اور اس کے ساتھیوں کے دردناک سزا کو بیان کیا ہے۔ چنانچہ در روز پنجشنبہ بست و ہفتم ماہ در قلعہ لاہور کے تحت لکھتے ہیں:

فرمودم کہ آں جماعت حرام نمک کہ ہمراہ	میں نے حکم دیا کہ جو نمک حرام گروہ خسرو
خسرو بودند از کنار دریا جو بہا سرش	کے ساتھ تھے جن کی تعداد تین سو تھی ان
تیز کردہ نصب کردند۔ وآں سی صد	کے لئے دریا کے کنارے لکڑیاں نصب کی
کس کہ با خسرو ہم سوگند بودند ہمہ را	جائیں جن کے سرے تیز ہوں اور پھر ان پر
فرمودم کہ بر بالائی آں چوب بہ مسند	ان تمام باغیوں کو لٹکا دیا جائے تاکہ یہ
نکبت و عبرت نشاندہ سربلند ساختند	جلد نہ مر جائیں بلکہ چیخیں چلائیں اور
صعب تر از یں ست کہ زود	عبرت کے ساتھ جان جان آفریں کے
بزودی میرند و آواز می کشند و بعبرت	سپرد کریں۔
تمام جان می سپارند۔ فاعتبروا منہ	
یا اولی الابصار (ق ۱۱۵ الف)	

اس کے بعد جہانگیر لکھتا ہے کہ وہ لاہور سے آگرہ واپس آیا تو اس نے خسرو کے مقابلہ میں شیخ فرید کی مدد کے لیے بیس ہزار فوج بھیجی اور دوسری طرف میر جمال الدین انجو کو خسرو سے بات چیت کیلئے وہاں روانہ کیا۔ خسرو میر جمال الدین انجو کی باتوں سے متاثر ہو کر مصالحت پر آمادہ ہو گیا، لیکن اس کے فتنہ پرور احباب نے اس کو ایسا کرنے سے روک دیا اور جواب دیا گیا کہ ہم جنگ کرنا چاہتے ہیں۔ تاکہ خدا خود ظاہر کر دے کہ وہ بادشاہت کس کو دینا چاہتا ہے اور

کس کے سر پر سلطنت کا تاج رکھنا پسند کرتا ہے۔ (ق ۱۱۷ ب)

چند دیگر نسخے: دنیا میں جہانگیر نامہ کے مختلف قلمی نسخے پائے جاتے ہیں جن میں کچھ نسخے چھپ کر منظر عام پر بھی آچکے ہیں۔ یہاں میں چند مطبوعہ اور مدون نسخوں کا خاص طور پر ذکر کرنا چاہتا ہوں تاکہ نسخۂ خدابخش سے تقابلی مطالعہ میں سہولت ہو اور نسخۂ خدابخش کی علمی و تاریخی اہمیت اہل علم حضرات کے سامنے آسکے۔

اس سلسلے میں پہلا قابل ذکر نسخہ وہ ہے جس کو ہنری بیورج (HENERY BEORIDGE) نے ایڈٹ کیا ہے۔ یہ دراصل سید احمد خاں کا مرتب کیا ہوا نسخہ تھا جس کا انگریزی ترجمہ الکزنڈر راجرس (ALEXANDER ROGERS) نے کیا تھا اور جن کو کچھ ترمیمات واصلاحات کے بعد ہنری بیورن نے ۱۹۰۹ء میں شائع کیا اور دوسرا ایڈیشن ۱۹۶۸ء میں منظر عام پر آیا۔ اس کتاب کے آغاز میں ہنری بیورج کا لکھا ہوا ایک مقدمہ ہے جس میں اس نے لکھا ہے کہ سید احمد خاں کا مدون کیا ہوا نسخہ غازی پور اور علی گڑھ سے ۱۸۶۴-۱۸۶۳ء میں شایع ہوا تھا۔ اس نسخے کا انگریزی ترجمہ الکزنڈر راجرس (ALEXANDER ROGERS) نے کیا، لیکن اس میں بہت ساری خامیاں اور غلطیاں پائی جاتی تھیں۔ اس لئے ہنری بیورج نے انڈیا آفس اور برٹش میوزیم کے مختلف نسخوں سے اس کا مقابلہ کرکے اس کی غلطیوں کی نشاندہی کی۔ جابجا ضروری معلومات کا اضافہ کیا اور اس طرح اس نسخے پر پوری طرح نظر ثانی کرکے اور اس کو جامع اور مکمل بنا کر لندن سے شایع کیا۔ اس سلسلے میں قابل ذکر بات یہ ہے کہ انہوں نے انڈیا آفس کے قلمی نسخے نمبر ۳۰۵ کو اساسی نسخہ قرار دیا ہے اور دوسرے قلمی نسخوں کو اس سے مقابلہ کیا ہے۔ کیونکہ اس اساسی نسخے میں اگرچہ سال کتابت اور کاتب کا نام درج نہیں تاہم ہنری بیورج کا خیال ہے کہ یہ قدیم ترین نسخہ ہے جس کی کتابت [illegible] میں ہوئی ہوگی۔ جہانگیر نامہ کا دوسرا قابل ذکر نسخہ ایران کا ہے جس کو ایران کے ایک معروف اسکالر

محمد ہاشم نے ایڈٹ کرکے انتشارات بنیاد فرہنگ تہران سے ۱۳۵۹ھ میں شایع کیا تھا۔ انہوں نے اس کتاب کے مقدمہ میں لکھا ہے کہ چار قلمی نسخوں کی مدد سے یہ کتاب مرتب کی گئی ہے۔ ان چاروں میں انڈیا آفس لندن کا ایک نسخہ ہے جو نمبر ۳۰۵ کے تحت درج ہے اور جس کو محمد ہاشم نے بھی اساسی نسخہ قرار دیا ہے۔ کیونکہ ان کے خیال میں یہ قدیم ترین نسخہ ہے جس میں اگرچہ سال کتابت اور کاتب کا نام درج نہیں تاہم ۱۰۴۰ھ کا مکتوبہ معلوم ہوتا ہے۔ دوسرا نسخہ بوڈلین کا ہے جس کا نمبر ۲۲۳ ہے۔ تیسرا نسخہ انڈیا آفس کا ہے جو نمبر ۳۱۱۲ کے تحت درج ہے اور جس کو محمد خاں نے مختلف نسخوں کے تعاون سے مدون کیا تھا۔ چوتھا نسخہ کتابخانہ مرکزی دانش گاہ تہران کا ہے جو نمبر ۱۰۰۴ کے تحت درج ہے۔ اس نسخے میں اگرچہ سال کتابت اور کاتب کا نام نہیں ملتا تاہم بقول محمد ہاشم خط کی روش سے اندازہ ہوتا ہے کہ یہ نہایت قدیم نسخہ ہے۔ لیکن چونکہ یہ ناقص الآخر ہے اور محض چند سال جلوس جہانگیری کے حالات وواقعات پر مشتمل ہے اس لئے اس کو اساسی نسخہ قرار نہیں دیا گیا۔

تقابلی مطالعہ: درج بالا سطور میں نسخۂ خدابخش کی جو تفصیلات پیش کی گئی ہیں اس سے یہ بات واضح ہوجاتی ہے کہ یہ دنیا کا قدیم ترین نسخہ ہے جس کی کتابت عہد جہانگیری کے چھٹے سال میں ہوئی۔ اس کے علاوہ اورنگزیب عالم گیر بادشاہ کے بیٹے محمد سلطان کی خود نوشت تحریر اور گولکنڈہ کے بادشاہ محمد قطب شاہ کی مہروں سے بھی اس کی علمی و تاریخی قدر و قیمت بہت بڑھ جاتی ہے۔ اس کے مقابلے میں جب ہم انڈیا آفس اور تہران کے نسخوں کو دیکھتے ہیں تو ان کے بارے میں مصدقہ طور پر کوئی بات نہیں کہی جاسکتی کیونکہ انڈیا آفس اور برٹش میوزیم لندن کے کیٹلاگ میں ان نسخوں کے تعارف سے ذیل میں کچھ ایسے ٹھوس ثبوت پیش کئے گئے ہیں جو ان کی تاریخ کتابت کو صاف صاف بیان کرسکے، بلکہ تاریخ کتابت کے بارے میں جو باتیں لکھی گئی ہیں وہ صرف قیاس وظنی ہیں۔ نہ کہ یقینی وقطعی۔

اب ہم تقابلی مطالعہ کے ذیل میں نسخہ خدابخش کی ایسی خصوصیات پیش کریں گے جو دوسرے مذکورہ نسخوں میں نہیں پائی جاتیں اور انہیں خصوصیات کی بنا پر خدابخش لائبریری کا یہ نسخہ تمام نسخوں پر فوقیت حاصل کر لیتا ہے اور علمی و تاریخی لحاظ سے اس کی اہمیت تمام نسخوں سے بڑھ جاتی ہے۔

تمہیدی بیان مسلم مصنفین کا عام دستور رہا ہے کہ وہ اپنی کتاب ایک تمہیدی بیان سے شروع کرتے ہیں، جس میں حمد باری اور درود کے بعد اپنی تصنیف کے اغراض و مقاصد پیش کرتے ہیں۔ جہانگیر بادشاہ فارسی زبان و ادب کا بہترین عالم تھا۔ اس موضوع کی کتابیں اس کے مطالعہ میں رہتی تھیں۔ پھر یہ کیسے ممکن تھا کہ وہ کوئی کتاب تصنیف کرے یا اپنی یادداشت کتابی صورت میں مرتب کرے اور حمد باری اور درود کا اسلامی طریقہ ترک کردے۔ اس لحاظ سے جب ہم نسخہ خدابخش کا مطالعہ کرتے ہیں تو اس کو اس خوبی سے آراستہ پاتے ہیں، کیونکہ یہ نسخہ ایک مقدمہ یا تمہیدی بیان سے شروع ہوتا ہے، جس میں وہ حمد باری اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم پر درود و سلام بھیجنے کے بعد تسخیر کائنات والی آیت قرآنی انی جاعل فی الارض خلیفہ پیش کرتے ہوئے اپنی جواں مردی اور جہانگیری کی طرف اشارہ کرتا ہے۔ یہ تمہیدی بیان گرچہ صرف ڈیڑھ صفحہ میں ہے لیکن زور بیان اور قوت تحریر کے لحاظ سے فارسی نثر نگاری کا بہترین نمونہ ہے۔ تمہیدی بیان آپ بھی ملاحظہ فرمائیں اور اس کی نثر نگاری کی داد دیں۔

" حمد بینہایت شکر بے نہایت مبدعی را کہ بیک امر کن اجرام فلکی و اجسام عنصری را از مکمن عدم بفضای وجود آورد و صانعی کہ طبقات افلاک را برافراست و بساط را بانواع قدرت آدمی زاد را بزیور نطق و زینت عقل اختصاص داد تا بداری تاج کرامت و خلعت خلافت پوشید و زمین و زمان را در قبضہ تسخیر خود در آورد۔ و ما یہ اِذْ قَالَ رَبُّکَ لِلْمَلٰئِکَۃِ

انی جاعل فی الارض خلیفہ مفتخر گشت۔ و درود بے شمار بر پیغمبر ما محمد مصطفےٰ باد کہ جہانیان را از جادہ ضلالت رہانید و بشاہ راہ طاعت رسانید۔" (ق اب)

لیکن اس کے بعد جب ہم انڈیا آفس کے نسخے (نمبر ۳۰۵) کا مطالعہ کرتے ہیں تو یہ نسخہ کسی تمہیدی بیان سے خالی نظر آتا ہے، بلکہ جہانگیر کے تخت شاہی پر جلوس کی تاریخ سے شروع ہوتا ہے جو یہ ہے:

" از عنایات بینہایات الٰہی یک ساعت نجومی از روز پنجشنبہ ہشتم جمادی الثانی ہزار و چہاردہ ہجری گذشتہ در دار الخلافہ آگرہ در سن سی و ہشت سال بر تخت سلطنت جلوس نمودم"۔ (ق (الف)

تاریخی واقعات نسخہ خدابخش میں ہمیں کچھ ایسے تاریخی واقعات ملتے ہیں جو انڈیا آفس کے نسخے میں نہیں پائے جاتے۔ یہ واقعات تاریخی لحاظ سے نہایت اہمیت کے حامل ہیں اور عہد جہانگیری کے نہایت شاندار اور گراں قدر کارناموں کی یاد دلاتے ہیں۔ اس لحاظ سے اس نسخے کو دیکھا جائے تو اس کی تاریخی و علمی اہمیت و عظمت بہت بڑھ جاتی ہے۔ مثال کے طور پر یہاں چند اہم واقعات تحریر کئے جاتے ہیں۔

۱۔ اس نسخے کے بیان سے واضح ہوتا ہے کہ تخت نشینی کے بعد جہانگیر بادشاہ نے اپنے دربار میں نہایت اہتمام سے جشن منایا جس کے لئے اس نے دربار سجائے، شادیانے بجانے اور شمع جلانے کا حکم صادر کیا اور درباریوں کو شرکت کی دعوت دی۔ یہ واقعات پوری تفصیل کے ساتھ ہمیں اس نسخے میں ملتے ہیں جو ڈیڑھ صفحات پر پھیلے ہوئے ہیں۔ چند جملے ملاحظہ ہوں:

" و بتخت مرصعی کہ پدرم بجہت تحویل حمل ساختہ بود ندکہ در وقت تحویل جشن نوروزی

بر بالائی آں قراری گرفتند قرار گرفتم۔ و آں تخت مرصعے را قریب یک اشرفی قیمت جواہر نفیس خرج شدہ کہ عبارت از دوبارہ نہصد ہزار تو بیان عراقست سوای پنجاہ من سلک ہندوستان طلائی سرخ کہ در انجا خرج شدہ و در ساختن آں بکار بردہ اند کہ پانصد من شاہی عراقست ..... چوں بریں تخت مراد قرار گرفتم فرمودم کہ ہفت ... نقارہ شادیانہ مینردہ باشند و تا قریب بچہل جریب زمین کہ در دوم تخت من بود ہمہ را بقالینہای زربفت و نمدہای ..... دوزی و عود سوزہای مرصع و طلا و نقرہ و شمعدان ہای فتیلہ عنبر سوز مزین کردہ بودند و ہر شب بر روی آں فرش فرمودم کہ قریب بہ سہ ہزار شمع کافوری ہمہ در لگنہای مرصع و طلا و نقرہ گذاشتہ و فتیلہ ہای عنبری مرتب کردہ تا صباح می سوختند۔ و امرای نامی از پانصدی تا پنج ہزاری قریب بہ ہفتند کسی ہمہ در میان جواہر و زینت فاخر پنہاں گشتہ در برابر دوش بر دوش بر ادب ایستادہ بودند[1]

اس کے برخلاف جب ہم انڈیا آفس کا نسخہ مطالعہ کرتے ہیں تو اس میں گرچہ ایک دوسری جگہ جشن نوروزی کا واقعہ مذکور ہے۔ لیکن شمع جلانے کے واقعات نہیں ملتے۔ اس کے علاوہ اس میں جہانگیر کے تاریخ جلوس شاہی کے بعد اکبر بادشاہ کی اولاد زندہ نہ رہے اور اس کے لئے بزرگان دین کی صحبتوں میں جانے اور خواجہ معین الدین کے مزار پر حاضری کے واقعات تحریر کئے گئے ہیں۔ جو تاریخی ترتیب اور واقعہ نگاری کے لحاظ سے بے جوڑ اور غیر مرتب انداز تحریر معلوم ہوتا ہے۔ جبکہ نسخہ خدابخش میں تاریخ جلوس جہانگیری کے بعد اس کے جشن کے واقعات تحریر کئے گئے ہیں۔ جو تاریخی ترتیب کے لحاظ نہایت برمحل اور مربوط ہیں۔

۲۔ اس نسخے میں جہانگیر نے جہاں آگرہ کا مفصل ذکر کیا ہے وہیں اس نے بنارس، گوالیار

[1] جہانگیر نامہ ق ۲ ب۔ ۳ الف

اور متھرا کے حالات و واقعات بھی تحریر کئے ہیں۔ یہ واقعات وہاں کے جغرافیائی، سماجی اور مذہبی امور سے متعلق ہیں۔ خاص طور پر وہاں کے مندروں اور ان کے تعمیری اخراجات کی تفصیلات پیش کی گئی ہیں جو تاریخی لحاظ سے نہایت اہم ہیں۔ چند جملے آپ بھی ملاحظہ فرمائیں:

"الحق عجب شہریست زبان مردم ایں شہر و گوالیار و متورہ کہ موضع کشن است کہ ہندواں آنرا بخدای پرستش می کنند یکیست و فصیح ترین زبان مردم ہند ایں چند شہر است کہ ذکر کردہ شد۔ و از الکہای ہند امتیاز تمام دارد۔ و در متوہرہ جر مہای پدر من مثل دختر راجہ مانسنگ و دیگر راجہای کلاں بتکدہای عالی ساختہ اند کہ ہر کدام یک لک و دو لک روبیہ خرج شاں شدہ و ہنوز عمارت آں نا تمام ماندہ۔ و بتکدہ ہای دیگر کردر انجا می سازند کہ راجہ مانسنگ سرکاری آں می نمود و خرج آن از مال پدر بر قریب ہشت لک یادہ لک روبیہ خرج آں بتکدہ نمودہ۔ و ہندواں آں بتکدہ را ایں اعتقاد... در بنارس بمیرو بہشت می رود بیہ[1]

لیکن یہ تاریخی معلومات ہمیں انڈیا آفس کے نسخے میں نہیں ملتے۔ بلکہ اس کے بجائے آگرہ کے ذکر کے بعد جہانگیر کے شاہی خاندان کے القاب و آداب پائے جاتے ہیں جو یہ ہیں:

"در ایں واقعات ہر جا صاحب قرآنی نوشتہ شود مراد امیر تیمور گورگان است۔ و ہر جا کہ فردوس مکانی بہ حکم در اید حضرت بابر بادشاہ است۔ و چوں جنت آشیانی مرقوم گردد ہمایوں بادشاہ و چوں عرش آشیانی مذکور گردد حضرت والد بزرگوار جلال الدین محمد اکبر بادشاہ غازی است"[2]

۳۔ جہانگیر نے تخت نشین ہونے کے بعد پہلا حکم زنجیر عدل کے نصب ہونے کے بارے میں

[1] جہانگیر نامہ ق ۷ ب۔ ۸ ب [2] جہانگیر نامہ از محمد ہاشم: ۴۰۔

صادر کیا تھا جس کا ذکر نسخہ خدا بخش اور نسخہ انڈیا آفس دونوں میں موجود ہے لیکن اس کے وزن کے بارے میں اختلاف پایا جاتا ہے۔ خدا بخش کے نسخے میں اس کی لمبائی چالیس گز اور وزن دس من لکھا ہے جو یہ ہے :

" واین زنجیر را زرگراں طلب کردہ از طلا فرمودم تا ساختند۔ طولش چہل گز ست مشتی بر شصت رنگ۔ وزن او قریب بدہ من می شود کہ یک صد من عراق بودہ باشد"[1]

جب کہ انڈیا آفس کے نسخے میں اس کی لمبائی تیس گز اور وزن ۱۴ من مذکور ہے۔

تاریخی فرق | خدا بخش اور انڈیا آفس کے نسخوں میں واقعات کی تاریخ کے لحاظ سے جا بجا فرق پایا جاتا ہے۔ یہاں صرف ایک واقعہ تحریر کیا جاتا ہے۔

جہانگیر جب تخت نشین ہوا تو اس نے اس کی تاریخ نسخہ خدا بخش میں ۲۰ جمادی الاول ۱۰۱۴ھ تحریر کی ہے۔ جو یہ ہے :

" بتاریخ بستم جمادی الاول ۱۰۱۴ھ صبح روز پنج شنبہ بود قریب یک ساعت بخوبی در شہر آگرہ در سن سی وہشت سالگی بر تخت بادشاہی نشستم و بادشاہ شدم"[2]

جب کہ انڈیا آفس کے نسخے میں ۲۰ جمادی الاول کے بجائے ۲۰ جمادی الآخر کی تاریخ ملتی ہے اس لحاظ سے دونوں میں ایک ماہ کا فرق پایا جاتا ہے۔ نسخہ خدا بخش چونکہ قدیم ترین اور صحت مند نسخہ ہے اس لئے اس کی تاریخ زیادہ معتبر تسلیم کی جائے گی۔

اسلوب بیان | خدا بخش لائبریری کے نسخے کا اسلوب بیان نہایت سہل، شگفتہ، دل نشیں اور خوبصورت ہے جس کے مطالعہ سے واضح ہوتا ہے کہ جہانگیر اعلیٰ پایہ کا فارسی داں اور نثر نگار تھا جس کو اس زبان پر پوری قدرت حاصل تھی۔ اس کے لئے مقدمہ کی عبارتیں پڑھی جاسکتی ہیں۔

---

[1] جہانگیر نامہ نسخہ خدا بخش ق ۱۱ ب [2] ایضاً ۱۲ الف۔

جو اوپر مذکور ہوئیں، تاہم دوسری جگہ کے چند جملے مزید ملاحظہ فرمائیں جو یہ ہیں :

" آبای امیر الامرا از شیراز اند۔ جدش خواجہ نظام الملک وزیر شاہ شجاع شیرازی بودہ و پدرش نسبت سادات و مجالست و مصاحبت بحضرت فردوس مکانی ہمایوں بادشاہ داشت۔ و در خدمت پدر بکمالی منزلت و عزت می بود" (ق ۲۲ الف)

اس کے علاوہ واقعہ نگاری کے لحاظ سے تمام واقعات میں باہم نظم و ضبط اور ہم آہنگی پائی جاتی ہے۔ ایک واقعہ کے بعد جب دوسرا واقعہ بیان ہوتا ہے تو ان دونوں میں تاریخی تسلسل اور آپس میں ربط معلوم ہوتا ہے۔ اس سلسلے میں اس کی وہ خوبی دہرائی جاسکتی ہے جو اوپر مذکور ہوئی کہ تاریخ جلوس شاہی کے بعد جہانگیر بادشاہ نے جشن کا واقعہ تحریر کیا ہے جو موقع و محل کے لحاظ سے نہایت مناسب ہے۔ اس کے برخلاف انڈیا آفس کے نسخے میں تاریخ جلوس شاہی کے بعد اکبر بادشاہ کے اولاد نہ ہونے اور اس کی خاطر خواجہ معین الدین کے مزار پر جانے کا واقعہ مذکور ہے جو موقع و محل کے لحاظ سے نہایت نامناسب ہے۔

اس سلسلے میں دوسری مثال اس کے آئین زنجیر عدل کی پیش کی جاسکتی ہے۔ جہانگیر بادشاہ جب تخت شاہی پر جلوہ گر ہوا تو اس نے ملک کے نظم و ضبط کی بقا کے لئے بارہ آئین اور اصول وضوابط مرتب کئے جن میں پہلا آئین زنجیر عدل کا تھا۔ اس کے بعد دار الشفا، کاشتکاری اور جاگیرداری کے قوانین تھے۔ جہانگیر بادشاہ نے ان قوانین کو اول، دوم، سوم، چہارم کر کے دوازدہم تک تحریر کیا ہے۔ چند قوانین آپ بھی ملاحظہ فرمائیں :

" نہم آنکہ کروریان و جاگیرداران زمین رعایا را بتعدی نگیرند، و زمین خود نسازند و زراعت دراں نکنند۔ دہم ہر کہ جاگیر دار پرگنہ باشد بپرگنہ دیگر حکم نکند۔ و بباہ پرگنہ دیگری نگیرد بزور۔ و ہر کس در جای خود سعی در زراعت و محصول خود

میکردہ باشد۔ یازدہم آنکہ حکام شہرہای کلاں دارالشفا در شہر خود ساختہ تعیین حکیم نمودہ ہر کس بیمار باشد بدارالشفا برند و از ہر کار من خرج کردہ تا او خوب شود و بفراغت خاطر او دا روانہ نماید" [1]

تاریخی اور قانون نویسی کے لحاظ سے یہ اسلوب بیان نہایت عمدہ، مناسب اور حسب حال ہے کیونکہ یہ فرامین شاہی ہیں، جنھیں اول، دوم، سوم وغیرہ کے ذیل میں پیش ہونا چاہئے تھا اور زبان و بیان بھی صاف ستھرا ہونا چاہئے تھا۔ لیکن اس کے برخلاف جب ہم محمد ہاشم (تہران) کے مدون نسخے کا مطالعہ کرتے ہیں تو اس میں ہمیں بے ترتیبی اور بے اصولی نظر آتی ہے۔ کیونکہ یہی بارہ قوانین جب اس میں بیان کئے گئے ہیں تو ہر نیا قانون لفظ " دیگر" کے تحت پیش کیا گیا ہے۔ ظاہر ہے دیگر اول و دوم کے مقابلہ میں مبہم لفظ ہے جس میں اس بات کی پوری وضاحت نہیں ہوتی کہ یہ کون سا قانون ہے اور ترتیب و اہمیت کے لحاظ سے کس مقام و مرتبہ کا حامل ہے۔ اس کے علاوہ جہانگیر بادشاہ کی فارسی دانی پر نظر ڈالئے تو یہ بات بعید از امکان معلوم ہوتی ہے کہ وہ قانون نویسی کے لئے کوئی مبہم اور غیر واضح لفظ استعمال کرے۔ بہرحال نسخہ خدا بخش کے تقابلی مطالعہ سے یہ بات بخوبی معلوم ہو جاتی ہے کہ خدا بخش لائبریری کا مذکورہ نسخہ نہایت اہم اور قدیم ترین ہے۔ جس میں مختلف قسم کی خوبیاں اور اچھائیاں نظر آتی ہیں۔ اس کے برخلاف ہنری بیورج اور محمد ہاشم کے مدون نسخے یقینی طور پر عہد جہانگیری کے نسخے نہیں ہیں۔ اس بنا پر ہمیں ان میں جا بجا زبان و بیان کی کمزوری اور بعض تاریخی معلومات کا فقدان دکھائی دیتا ہے۔

---

[1] جہانگیر نامہ نسخہ خدا بخش ق ۱۱۳

حقیقت لمعہ

از جناب سید اختر حسن اسٹرا اختر صاحب ٭

جنوری سنہ ۲۰۰۰ء کے معارف میں پروفیسر اکبر رحمانی صاحب نے اپنے مضمون "علامہ اقبال کا برقی علاج: بھوپال جانے کا مشورہ کس نے دیا" میں ایک ایسی بحث کو جو راقم کی دانست میں گیارہ سال پہلے ختم ہو چکی دوبارہ زندہ کرنے کی فضول کوشش کی ہے۔ نومبر ۲۰۰۰ء کے "معارف" میں بھی ان کا تحقیقی مضمون شایع ہوا تھا جو دراصل لمعہ کے سلسلے کی ہی ایک کڑی ہے، جسے بطور پیش بندی رقم کیا گیا ہے اور اقبالیات کے ایک اہم عنوان کی آڑ میں بلا لحاظ دستور ادب اس ناچیز کو نشانہ بنایا گیا ہے۔ راقم پہلے ان کے اس مضمون پر گفتگو کی اجازت چاہتا ہے کیونکہ موصوف نے قارئین "معارف" کو اصل موضوع سے بے خبر رکھتے ہوئے راقم کی معروضات کے سیاق و سباق میں جائے بغیر یہ باور کرانے کی کوشش کی ہے کہ گویا اس ناچیز نے بزعم خود خطوط اقبال کو جانچنے پرکھنے کے قوانین وضع کئے ہیں۔ جب کہ حقیقت یہ ہے کہ آج سے گیارہ سال قبل راقم نے اپنی کتاب "اقبال کے کرم فرما" میں لمعہ اور صرف لمعہ کی فریب کاریوں کا پردہ چاک کرنے کی کوشش کی ہے۔ ذرا غور کیجئے کہ اول تو پروفیسر اکبر رحمانی صاحب ایک طویل عرصے کے بعد نیند سے جاگے ہیں جب کہ اقبالیات میں سینکڑوں خطوط کا اضافہ ہو چکا ہے خطوط اقبال

٭ کربلا نیر منصب منزل۔ بھوپال۔

کے بہت سے الفاظ کو درست و تبدیل کیا جا چکا ہے اور کئی تواریخ طے کی جا چکی ہیں اور دو دیم یہ کہ جناب رحمانی صاحب کو اس ناچیز کو خواہ مخواہ مجرموں کے کٹہرے میں کھڑا کرنے سے پہلے اس ناقابل تردید سچائی کا بھی خیال نہ رہا کہ تحقیق میں کوئی بھی عمل حرف آخر نہیں ہوتا۔ حالانکہ جو قارئین اس بحث سے واقف ہیں یا جو ادبی مسائل کو سمجھنے کی تھوڑی بھی صلاحیت رکھتے ہیں متذکرہ مضمون میں انہیں یہ سمجھ لینے میں ذرا بھی دیر نہ لگی ہوگی کہ پروفیسر اکبر رحمانی صاحب کا اصل مطمح نظر کیا ہے؟ نیز یہ کہ موصوف کی ناراضگی کا اصل سبب کیا ہے۔ اس لئے راقم کو اپنی صفائی میں کچھ کہنے کی چنداں ضرورت نہ تھی لیکن چونکہ متذکرہ مضمون رحمانی صاحب کی ادبی حکمت عملی کی پہلی کڑی ہے اسلئے اس کا جواب دینا راقم کے لئے لازمی ہو گیا ہے جو ایک طویل بحث کا متقاضی ہے اور چونکہ میری آنے والی کتاب کا موضوع یہ اور ایسے ہی چند باقی ماندہ مباحث ہیں اس لئے فی الحال صرف اتنا ہی عرض کر سکتا ہوں کہ متذکرہ مضمون کی کوئی بھی دلیل راقم کی تحقیق میں توسیع کا سبب تو بن سکتی ہے لیکن منفی انداز میں عائد نہیں ہوتی۔ یہ پروفیسر اکبر رحمانی صاحب کی سوچ ہے کہ انہیں حدود ادب سے متجاوز ہونے کا بہانہ مل گیا۔

آئیے اب اکبر رحمانی صاحب کی حکمت عملی کی دوسری کڑی یعنی جنوری سنہ ۲۰۰۱ء کے "معارف" میں ان کے مضمون کا جائزہ لیں۔ اس سلسلے میں راقم کو پہلے تو یہ عرض کرنا ہے کہ موصوف نے یکم دسمبر سنہ ۱۹۳۲ء کے جس مکتوب کو اپنے دعوے کی بنیاد بنایا ہے وہ صد فیصد وضعی ہے۔ (ملاحظہ کیجئے "اقبال کے کرم فرما" جس کے ثبوتوں کو رحمانی صاحب نے زیر بحث مضمون میں چھوا تک نہیں ہے)، ہٹ دھرمی کی اس سے اعلیٰ ترین مثال کیا ہوگی کہ اسی سلسلے میں جناب عبد القوی دسنوی صاحب کی ایک تحقیقی خامی کو جس کی نشاندہی راقم پہلے ہی کر چکا ہے سہارا بنا کر اپنے دعووں کی بیل چڑھائی ہے، اس ضمن میں بھی راقم کو جناب اکبر رحمانی صاحب کا شکر گذار ہونا چاہئے کہ انہوں نے راقم کی

گیارہ سال پرانی پیشین گوئی کو سچ کر دکھایا؛ ملاحظہ کیجئے "اقبال کے کرم فرما" صفحہ کا یہ جملہ:

"تو پھر عبد القوی دسنوی صاحب کے سامنے اکبر رحمانی صاحب کے موقف کو قبول کرنے کے علاوہ کوئی چارہ نہیں ہے"

جیسا کہ پہلے عرض کیا جا چکا ہے دراصل زیر بحث مضمون پروفیسر اکبر رحمانی صاحب کی ادبی حکمت عملی کی دوسری کڑی ہے۔ وہ جانتے ہیں کہ جب تک وہ یکم دسمبر سنہ ۱۹۳۲ء کے مکتوب کی صداقت کو ثابت نہیں کر دیتے۔ بھوپال میں علامہ اقبال کے بجلی کے علاج کے مشورے کے دعوے کو ثابت نہ کر پائیں گے۔ یہ نہ ہوگا تو پھر وہ علامہ سے لمعہ کے گہرے تعلق کو کیسے قائم کر سکیں گے لہٰذا انہوں نے اپنی دانست میں پہلے تو راقم کو جھوٹا اور اس کی کاوش کو گمراہ کن قرار دے دیا (معارف نومبر سنہ ۲۰۰۰ء) اور پھر جنوری سنہ ۲۰۰۱ء کے "معارف" میں اپنا دعویٰ دائر کر دیا۔

پروفیسر اکبر رحمانی صاحب کا یہ دعویٰ کہ حضرت لمعہ نے علامہ اقبال کو بھوپال میں بجلی کے علاج کا مشورہ دیا کوئی نیا نہیں ہے۔ دس سال پہلے وہ متعدد بار یہ کوشش کر چکے ہیں۔ لمعہ صاحب کی شکل و صورت کو سدھارنے سنوارنے کے ان کے اور بھی کئی دعوے تھے۔ ہند و پاک کے سرکردہ ادبی جرائد و رسائل اس لاحاصل بحث سے اوب چکے ہیں۔ ایک "معارف" ہی رہ گیا تھا اب وہ اس پر بھی مہربان ہوئے ہیں۔

عملاً تو دس سال پہلے یہ بحث ختم ہو چکی ہے۔ سارے ہنگامے سارے دعوے سرد پڑ چکے تھے لیکن اب پھر شاید اس خیال سے کہ اب اتنا عرصہ گزر جانے کے بعد لوگ سچائیوں کو بھول چکے ہوں گے یا پھر اس خیال سے کہ زندگی بھر کی کمائی کو کسی مصرف میں لایا جائے۔ ٹھیک اسی طرح جیسے کوئی تقریب ختم ہو جائے اور دعوت کا بچا کھچا ضرورت مندوں میں تقسیم کر کے کسی مصرف میں لایا جائے۔

متذکرہ مضمون میں ایک غیر مطبوعہ مکتوب کے علاوہ کچھ بھی نیا نہیں ہے اور اس کی بھی کوئی اہمیت اس وجہ سے نہیں ہے کہ اس کا عکس شامل نہیں کیا گیا ہے۔ ہاں اگر اس میں کچھ قابل توجہ ہے تو وہ جناب عبدالقوی دسنوی صاحب کو خواہ مخواہ اور زبردستی کھینچ لانے کا عمل ہے۔

خواہ مخواہ ان معنوں میں کہ جب راقم جناب عبدالقوی دسنوی صاحب کی غلطی کی پہلے ہی نشاندہی کر چکا ہے اور ان کے بے جا دلائل کو مسترد کر چکا ہے جس کا ذکر زیر بحث مضمون میں جگہ جگہ ہے تو پھر پروفیسر اکبر رحمانی صاحب کے پاس انہیں اپنے موقف کو استحکام دینے میں استعمال کرنے کا کیا جواز ہے؟؟؟

اور زبردستی ان معنوں میں کہ اقبال "کے کرم فرما" کا جو پیراگراف عبدالقوی دسنوی صاحب کے زیر تذکرہ پروفیسر اکبر رحمانی صاحب نے زیر بحث مضمون میں نقل کیا ہے اس کے پورے سیاق و سباق سے روگردانی کرتے ہوئے یعنی اس کا اگلا پچھلا چھوڑ کر قاری کے ذہن میں وہ بات بٹھانے کی کوشش کی ہے جس کا اس پیراگراف سے قطعی کوئی تعلق نہیں ہے جس کی اصل سچائی یہ ہے کہ راقم نے یکم دسمبر ۱۹۳۴ء کے مکتوب کو کلی طور پر وضعی ثابت کر کے جناب عبدالقوی دسنوی صاحب کو پہلے اس خط پر توجہ مرکوز کرنے کا مشورہ دیا ہے (اقبال کے کرم فرما صفحہ)

تعریف کی بات یہ ہے کہ عبدالقوی دسنوی صاحب کا ہماری زبان مورخہ ۵ اپریل ۱۹۸۹ء کا وہ مضمون جس نے بلا منت جناب پروفیسر اکبر رحمانی صاحب کو کچھ بولنے کا موقع فراہم کیا، ان کی نظر میں وہی صاحب مضمون لائق عتاب اور کلمات نازیبا کا حق دار ٹھہرا۔ قارئین ذرا انصاف فرمائیں کہ عبدالقوی دسنوی صاحب کا محولہ مضمون لمعہ مخالفت میں تھا پھر ایسے مکتوب کو جو سر سے پیر تک جعلی تھا وہ اسے جان بوجھ کر کیوں چھوڑ دیتے؟ ظاہر ہے

کہ یہ سہوا ان سے انجانے میں ہوا جس سے وقتی طور پر ہی سہی فائدہ تو اکبر رحمانی صاحب کو ہی پہنچا۔ پھر بھی اکبر رحمانی صاحب نے ان جیسی محترم شخصیت پر بددیانتی جیسے الزام تھوپنے میں ذرا بھی ہچکچاہٹ محسوس نہ کی۔ قارئین کرام براہ کرم "اقبال کے کرم فرما" ملاحظہ فرمائیں تبھی ان کی سمجھ میں یہ بات آسکتی ہے کہ جناب پروفیسر اکبر رحمانی صاحب جو کرنا چاہیں وہ کر ہی لیتے ہیں اور جو کہنا چاہیں وہ کہہ ہی دیتے ہیں بھلے ہی کوئی جواز موجود ہو یا نہ ہو۔ سکے کے دونوں پہلوؤں پر انہی کا حق رہتا ہے۔

راقم کئی بار جناب اکبر رحمانی صاحب سے درخواست کر چکا ہے کہ لمعہ کے نام علامہ اقبال کے جن خطوط اور اقبالیات سے متعلق تحریروں کا وہ اپنی تحویل میں ہونے کا دعویٰ کرتے ہیں براہ کرم ان کے عکوس شائع کرائیں؛ نیز ان کی صداقت کی جانچ بھی کسی معتبر ادبی شخصیت سے کرائیں لیکن افسوس کہ وہ اس سے ہمیشہ محترز رہے اور آج تقریباً پندرہ سال بعد بھی ہنوز روز اول ہے۔ پتہ نہیں وہ ان تحریروں کی تدوین سے کیوں خوفزدہ ہیں؟ حال ہی میں انہوں نے خدا بخش جرنل پٹنہ میں لمعہ کے نام علامہ اقبال کی جانب سے ایک رجسٹری کا اکنالجمنٹ اپنی تحویل میں ہونے کا ذکر کیا ہے لیکن اس کا بھی عکس شامل نہیں کیا۔ اسی طرح زیر بحث مضمون میں بھی ایک غیر مطبوعہ خط کا متن شامل کیا ہے لیکن اس کا عکس شامل نہیں کیا۔ حالانکہ ایک نئی دریافت کے سبب اصولاً اور لمعہ جیسی فریب ساز شخصیت کے تعلق سے لازماً اس کا عکس شائع کرانا لازمی تھا۔ لیکن راقم انتہائی افسوس کے ساتھ بار بار دہرائی ہوئی بات پھر دہرانے پر مجبور ہے کہ جناب اکبر رحمانی صاحب آج بھی اپنے منھ سے نکلی ہوئی بات کو سند کا درجہ دئے جانے پر مصر ہیں۔

آخر میں قارئین کی سہولت و معلومات کے لئے یہ عرض کرنا ہے کہ "اقبال نامہ" مرتبہ شیخ

عطاراللہ حصہ اول میں لمعہ کے نام علامہ اقبال کے یا علامہ اقبال کی جانب سے ۲۹ خطوط شامل کئے گئے ہیں۔ راقم کی حالیہ تحقیق کے مطابق ان میں ۲۳ وضعی ہیں اور باقی ۶ خطوط تحریر و تخفیف زدہ ہیں۔ "اقبال کے کرم فرما" میں راقم نے آخری خط یعنی انیسویں مکتوب کو بالکل صحیح گردانتے ہوئے ص۲۵ کی پہلی سطر پر اس مکتوب کے آخری جملے پر شک کا اظہار کیا تھا جو الحمد للہ بالکل صحیح ثابت ہوا۔ لمعہ صاحب نے اس مکتوب میں اس خوبصورت جملے کا اضافہ کیا تھا:

"اور آپ سے ملاقات کی آرزو رکھتے ہیں۔"

قارئین کرام یہ جان کر حیران رہ جائیں گے کہ لمعہ کی اس کارگزاری کا انکشاف نہ تو راقم نے کیا نہ ہی کسی اور نے کیا۔ بلکہ یہ کارنامہ خود جناب پروفیسر اکبر رحمانی صاحب نے انجام دیا ہے۔ جنوری ۱۹۹۱ء کے "طلوع افکار" میں موصوف نے خود اس خط کا اصل متن شایع کیا ہے۔ جس میں یہ خوبصورت جملہ نہیں ہے[1]۔ اس اصل متن کی اشاعت کے بعد کوئی بھی یہ مان لینے میں حق بجانب ہے کہ اول تو لمعہ کے تعلق سے وہ بھوپال میں علاج کا معاملہ ہو یا کوئی اور معاملہ لمعہ کی کسی بھی بات پر کیونکر یقین کیا جائے ؟؟ دوم یہ کہ جب خود اکبر رحمانی صاحب نے لمعہ کی فریب کاری کا پردہ فاش کیا ہے تو گویا انہوں نے سچائی سے سمجھوتا کر لیا۔ لیکن افسوس کہ اب پھر بقول غالب ؎

چھوڑوں گا میں نہ اس بت کافر کا پوجنا
چھوڑے نہ خلق گو مجھے کافر کہے بغیر

---

[1] معارف: طلوع افکار کے مضمون کے پہلے صفحہ کا عکس مضمون نگار نے ہم کو بھیجا ہے مگر اس کی اشاعت غیر ضروری ہے۔

معارف کی ڈاک

لندن ۱۰ / مارچ ۲۰۰۱ء

مکرمی و محترمی مولانا اصلاحی صاحب! السلام علیکم و رحمۃ اللہ

سید صاحب رحمۃ اللہ علیہ کے تعزیتی مضامین جو "یاد رفتگاں" کے عنوان سے شایع ہوئے ہیں۔ منجانب مجلس نشریات اسلامی کراچی[1]۔ ان میں ایک مضمون مولانا ابوالبرکات عبدالرؤف دانا پوری پر ہے۔ اس میں سید صاحب نے مرحوم کے سب سے آخری کارنامے کے طور پر ان کے ایک خطبے کا ذکر کیا ہے جس میں موصوف نے پاکستان میں اصول خلافت کی بنیاد پر حکومت کی تاسیس سے معذوریوں کا بیان فرمایا تھا۔ میں نے اس کے حوالے سے گزارش کی تھی کہ شاید اس کی کوئی کاپی آپ کے یہاں ہو۔ اگر ہو تو از راہ کرم مجھے ایک نقل فراہم فرمائیے[2]۔ اس عریضے کا ذکر برادر محترم سید سلمان ندوی صاحب سے بھی آیا جو آج کل انگلینڈ میں ہیں۔ انہوں نے بھی یہی خیال ظاہر فرمایا کہ شاید خط پہنچا نہیں۔ میں اب دوبارہ گزارش کر رہا ہوں۔ مجھے اس مسئلے سے دلچسپی ہے۔ یہ خطبہ شاید مفید ثابت ہو۔

معارف ماشاء اللہ برابر آ رہا ہے۔ اب تک یہ بڑی کمی تھی کہ یہاں بس جانے کے بعد سے بس معارف جب ہی دیکھنے میں آتا تھا جب ہندوستان جانا ہو۔ بعض چیزوں پر اظہار خیال کرنے

---

[1] معارف: یہ کتاب دارالمصنفین سے بھی شایع ہوئی ہے [2] افسوس ہے کہ یہ خطبہ کتب خانہ دارالمصنفین میں نہیں ہے ممکن ہے خدا بخش لائبریری یا کسی اور کتب خانہ میں ہو۔ ان کے ذمہ داروں سے درخواست ہے کہ وہ فراہم کر دیں۔

کا بھی داعیہ پیدا ہوا، مگر مصروفیتوں نے موقع نہ دیا۔ اب یہ عریضہ لکھنے بیٹھ ہی گیا ہوں تو اگست تا اکتوبر شایع ہونے والے مضمون "ماہیئت باری تعالیٰ" اور مولانا محمد شہاب الدین ندوی کے بارے میں عرض کروں گا کہ معارف میں اس کی اشاعت تو کسے لئے ایک معمہ بنی رہی۔ پہلو بہت ہیں اور ایسے کہ "کرشمہ دامن دل می کشد کہ جا اینجاست" مگر تفصیل میں جانا نہیں چاہتا۔ صرف ایک بات عرض کروں گا جس کا تعلق مضمون کے اصل مدعا سے ہے۔ یعنی جسمانیت باری تعالیٰ کا اثبات اور وہ یہ کہ اس دعوے نے جس کے زیر اثر امام غزالی اور امام رازی جیسے اساطین بھی چنداں قابل لحاظ نہ رہ سکے، علامہ شبلیؒ کی الکلام یاد دلادی۔ جس میں علامہ نے بڑے فخر سے لکھا تھا:

"دنیا اس عالمگیر میں تاریکی میں پڑی ہوئی تھی کہ دفعۃً اسلام نے آکر ان تمام غلط خیالات اور معتقدات کا پردہ چاک کر دیا۔ اس نے بتایا کہ خدا واحد محض ہے اور زمان و مکان جہت و اشارہ تحت و فوق ہر قسم کے قیود و خصوصیات سے مبرا ہے۔ یہ وہ تقدیس و تنزیہہ تھی، جس پر یورپ نے بھی حیرت ظاہر کی۔ ..... بے شبہ اسلام کو ایسی ہی وسیع الخیالی کی بنیاد قائم کرنی تھی جو جسمانی خصوصیات سے بالکل مبرا ہو۔

اس تقدیس کی بنیاد پر اسلام نے ہر قسم کی بت پرستی کا استیصال کر دیا۔ کیونکہ اسلام نے خدا کی نسبت جو پاک اور منزہ خیال قائم کیا تھا وہ ایسا نہ تھا کہ خدا کا تصور جسمانی پیکر اور صورت کے بغیر، دلوں میں نہ آسکے۔ ہندو، مصری، صابی، رومن کیتھولک سب خدا کے تصور کے لئے جسمانی تمثیل کے محتاج تھے اور اس وجہ سے بت پرستی میں مبتلا تھے لیکن اسلام میں باوجود سینکڑوں ہزاروں فرقوں کے پیدا ہوجانے کے بھی کسی فرقے کو آج تک بت پرستی کا کبھی خیال نہ آسکا ....." (ص ۵۲-۲۵۱- مطبوعہ اکیڈمی۔ کراچی)[1]

---

[1] پاکستان کے ناشرین تو دار المصنفین کی کتابیں غلط سلط چھاپ کر اسے تباہ کرنے میں لگے (بقیہ حاشیہ ص ۲۸۹ پر)

میرے خیال میں یہ حیرت کچھ بے جا نہیں قرار دی جائے گی کہ عقائد کے معاملے میں جس چیز کو مولانا شبلی نے اسلام کا فخر قرار دیا معارف میں اسی کو ایک مہمل اور فرسودہ خیال بتایا جارہا ہے! میں واللہ نہ سمجھ سکا کہ ایسا کیونکر ہوسکا۔[1] والسلام

نیاز مند

عتیق الرحمن سنبھلی

وکاس نگر، لکھنؤ۔ ۴ مارچ ۲۰۰۱ء

مکرم و محترم جناب اصلاحی صاحب! السلام علیکم ورحمۃ اللہ

علی گڑھ کی ملاقات بہت تشنہ رہی۔ ایک بار یاددہانی کر دوں کہ جناب شہاب الدین صاحب کو میرا پتہ ضرور بھجوا دیجئے یا ان کا پورا صحیح پتہ مجھے روانہ فرمادیں۔ انھوں نے جس اہم کام کے لیے ایک پس منظر فراہم کر دیا ہے وہ بے حد قابل ستایش ہے، میں جس طرح اسے آگے بڑھانے کا متمنی ہوں اس سے بیک وقت کئی مقاصد پورے ہوسکتے ہیں۔ خیر یہ بہت تفصیلی بات ہے جس کے لئے آپ سے اور مولانائے محترم سے وقت لینا درکار ہوگا۔

والسلام۔ احقر: معزز علی بیگ

(بقیہ حاشیہ ص ۲۸۸) ہوئے ہی تھے، اب ہندوستان میں بھی یہ کاروبار دھوم سے ہو رہا ہے کیا آپ خود لندن میں مقیم پاکستانیوں سے اس کے متعلق مضامین لکھ کر اس کا کوئی تدارک کر سکتے ہیں؟ ایک زمانے میں شورش کاشمیری مرحوم مدیر چٹان اور حمید نظامی مرحوم اڈیٹر نوائے وقت نے بڑی زوردار مہم چلائی تو کچھ روک تھام ہوئی مگر افسوس ع آں قدح بشکست وآں ساقی نماند۔ دار المصنفین کے مطبوعہ ایڈیشن میں یہ تحریر تفصیلی عقائد ذات وصفات کے زیر عنوان الکلام ص ۱۴۱ و ۱۴۲ پر ہے لہ میں شکر گذار ہوں کہ آپ نے اس پہلو کی جانب توجہ دلائی مگر اصل مسئلہ یہ ہے کہ اس تغیر پذیر دنیا میں کوئی چیز ہر وقت فکر تازہ نہیں رہ سکتی سوائے اسلام کے جو ابدی اور غیر متغیر ذہن ہے لیکن اس کی تعبیر و تشریح کا انداز ہر زمانے میں جدا اور نیا ہوسکتا ہے مولانا شہاب الدین صاحب جدید علم کلام کا پس منظر فراہم کرنا چاہتے ہیں اب یہ آپ جیسے اصحاب علم و نظر کا کام ہے کہ ان کے کام کی قدر و قیمت کا تعین کریں اور اس کے نقص کی طرف ان کو متوجہ فرائیں۔ وفوق کل ذی علم علیم۔

تلخیص و تبصرہ

پولینڈ میں اسلام اور مسلمان

از ضیاء الرحمٰن اصلاحی

"حال ہی میں ضیاء الرحمٰن اصلاحی صاحب کا شعبۂ تصحیح میں تقرر ہوا ہے، وہ ہونہار ہیں آیندہ بھی ان کے ترجمے اور تلخیص شایع ہوں گی۔" (ض)

تقریباً چھ سو سال قبل خانہ جنگی کی وجہ سے تاتاریوں کو اپنا وطن چھوڑنا پڑا تو انہوں نے پولینڈ کی ایک ریاست لیتھونیا میں پناہ لی اور فوجی ملازمت اختیار کرلی۔ اس کی وجہ سے ان کو مساجد کی تعمیر، مقامی عورتوں سے نکاح اور اپنے بچوں کی دینی تعلیم و تربیت کی مراعات حاصل ہوئیں۔ اس زمانے میں پولینڈ کے مسلمان ترقی کی شاہراہ پر گامزن تھے۔ اس وقت وہاں ان کی تعداد دو لاکھ اور ۱۶۰ مسجدیں تھیں۔

لیکن سولھویں صدی عیسوی کے آتے آتے ان تاتاری مسلمانوں کا رشتہ اپنی مادری زبان سے کمزور ہوگیا اور انہوں نے مقامی سلوفیائی زبانوں کو اپنانا شروع کیا، اس کے علاوہ مرور ایام سے انہوں نے پولینڈ کے عادات و اطوار اور رسم و رواج کو بھی اختیار کرلیا اور بدقسمتی سے اکثر اپنے اصل مذہب اسلام پر بھی قائم نہیں رہے جس کا ایک خاص سبب مقامی عیسائی عورتوں سے رشتۂ مناکحت تھا۔ ان عیسائی ماؤں نے اپنے بچوں کی پرورش عیسائی مذہب کے مطابق کی۔ پولینڈ کے مسلمانوں کی باقیات نے ۱۹۱۷ء میں "پولش مسلم یونین" کے نام سے ایک

تنظیم قائم کی۔

دوسری عالمگیر جنگ کے بعد پولینڈ کی سرحدیں تبدیل ہوگئیں جس کی وجہ سے ڈرامائی طور پر مسلمانوں کی تعداد بہت کم ہوگئی، مساجد برائے نام رہ گئیں، مفتیوں اور قاضیوں کی حیثیت بہت فروتر ہوگئی۔ کمیونسٹوں کی نئی حکومت میں بہت سے مسلمانوں کو سائبیریا میں جلاوطن کردیا گیا، ان کی املاک پر قبضہ کرلیا گیا اور مسجدیں مقفل کردی گئیں۔

اس انقلاب کے بعد پولینڈ میں تاتاریوں کی تعداد پانچ ہزار کے قریب ہوگئی، اسلامی تعلیمی اداروں کے فقدان کی وجہ سے باقی رہ جانے والے مسلمانوں کی اکثریت اسلام کے بارے میں بہت محدود معلومات رکھتی ہے۔ یوہونیکی اور کرسزائینین کی دونوں پرانی مسجدوں کا مصرف بھی جشن عید منانے اور ثقافتی تقریبات کے انعقاد تک ہی محدود ہوگیا ہے۔

لیکن اب عرب مسلمانوں کی ایک بڑی تعداد وہاں پہنچ گئی ہے۔ ان کے اثر سے پولینڈ میں دوبارہ اسلامی بیداری کے آثار ظاہر ہونے لگے ہیں اور دینی و دعوتی کاموں کے سلسلے میں زیادہ سنجیدہ کوششیں طلبہ کی جانب سے ہو رہی ہیں۔ ۱۹۸۹ء میں مسلم اسٹوڈنٹس سوسائٹی کا قیام عمل میں آیا جو منجملہ اور کاموں کے تاتاری بچوں کے لیے اسلام کی ابتدائی تعلیم پر خاص توجہ مبذول کر رہی ہے۔

مسلمانوں کی موجودہ صورت حال پولینڈ کی مسلم آبادی اب تیس ہزار سے زیادہ ہوگئی ہے ان میں ۵ ہزار تاتاری اور ۲۵ ہزار غیر ملکی ہیں۔ نومسلموں کے اعداد و شمار تو نہیں ملتے، لیکن اندازاً یہ ۵۰۰ سے ایک ہزار کی تعداد میں ہوں گے۔ عددی قلت کی بنا پر معاشی اور سیاسی محاذ پر ان مسلمانوں کی کوئی نمائندگی نہیں ہے، لیکن ان کا معیار زندگی پولینڈ کے عام باشندوں کی طرح اچھا ہے۔

پولینڈ کی غالب آبادی تقریباً ۹۹ فیصد عیسائیوں پر مشتمل ہے۔ مسلمان بہت کم ہونے

کی وجہ سے وہاں کی حکومت پر اثر انداز ہونے کی پوزیشن میں نہیں ہیں۔ اکثریت کے لئے اسلام اور مسلمان دونوں اجنبی اور بے گانہ ہیں۔ جائز ذبیحے کی صرف ایک ہی دکان پولینڈ کے دارالحکومت وارسا میں ہے، پنج وقتہ نماز پڑھنے کے لئے مساجد یا عمارتیں نہیں ہیں، اکثر لوگوں کو طلبہ کے ہوسٹلوں میں نماز ادا کرنی پڑتی ہے۔ اسلام کی تبلیغ و اشاعت اور دینی خدمات اور سرگرمیاں انجام دینے کے لئے فنڈان کے پاس نہیں۔ مرکزیت اور تنظیم نہ ہونے کی وجہ سے پولینڈ کے مسلمانوں کا شیرازہ منتشر ہے، جو تنظیمیں ہیں ان میں اور مسلمانوں میں ربط و تعاون نہیں، کوئی ایسی فعال و موثر شخصیت بھی نہیں جو دعوت دین کے لئے اپنے کو وقف کر سکے، جن لوگوں میں کسی قدر جوش و ولولہ بھی ہے تو ان کے پاس وقت اور سرمایہ نہیں، کیونکہ یہاں کے مسلمانوں کی معاشی حالت اچھی نہیں ہے۔

دعوت کے راستے کی دشواریاں دیگر مغربی ملکوں کی طرح پولینڈ میں بھی اسلام کے خلاف پروپیگنڈا کی مہم زور و شور سے جاری ہے، اسلام اور مسلمانوں کے متعلق اکثر لوگوں کا تصور غلط اور منفی ہے، عیسائی اسلام پر عیسائیت کی برتری دکھانے میں سرگرم ہیں، وہ تیسرے درجے کے شہری سمجھے جاتے ہیں، اسلام سے واقفیت کا ذریعہ مستشرقین کی کتابیں ہیں جو غلط اور باطل معلومات سے پُر ہوتی ہیں صحیح اسلامی تعلیمات پر مشتمل کتابیں یہاں میسر نہیں، مدارس اور کتب خانوں میں اسلامی ادب کے نام سے وہی کتابیں ملتی ہیں جو غیر مسلموں نے لکھی ہیں۔ مثلاً قرآن مجید کے صرف دو ترجمے ملتے ہیں اور یہ دونوں غیر مسلموں کے قلم سے ہیں، ایک ترجمہ ایک مستشرق (بلیولاسکی) کا ہے جو مطالب کی غلط ترجمانی میں اپنی مثال آپ ہے۔ دوسرا ترجمہ قادیانیوں کا ہے، مطابع انہی کو شائع کرتے ہیں۔

پہلے بتایا جا چکا ہے کہ مسلمانوں میں باہمی اتحاد و تعاون کی بڑی کمی ہے۔ تاتاریوں کو اسلام کی

بنیادی باتوں سے واقفیت نہیں اور وہ دوسرے مسلمانوں سے ربط و تعلق رکھنا پسند نہیں کرتے

ذیل میں پولینڈ کی بعض اسلامی تنظیموں کا ذکر کیا جاتا ہے۔

۱۔ پولش مسلم مرکز کل :- اس کے مقاصد یہ ہیں:

۱-۱ اسلامی سرگرمیوں میں باہمی ربط و تعاون ۲-۱ اسلامی لٹریچر کا ترجمہ و اشاعت

۳۔ انٹرنٹ کے ذریعہ اسلام کی اشاعت اور اس کے لئے دو ویب سائٹ کا اہتمام

۴۔ انگریزی زبان میں ایک اور پولینڈ کی زبان میں دو اسلامی رسالوں کی اشاعت

۵۔ پولینڈ کے مسلمانوں کے بارے میں معلومات کی فراہمی ۶۔ اسلام کے بارے میں معلومات کو پختہ تر بنانے کے لئے باضابطہ اجتماعات کا انعقاد ۷۔ غیر مسلموں کے لئے خطبات کا اہتمام اور ذرائع ابلاغ سے رابطہ وغیرہ۔

۲۔ پولش مسلم یونین :- تاتاری رسم و رواج کا فروغ ۲۔ بیالستوک میں ایک مسجد کی تعمیر ۳۔ مسلم قبرستانوں کی دیکھ بھال

اس تنظیم نے حال ہی میں تاتاری بچوں کے لئے کچھ دینی تعلیمی ادارے مسلم اسٹوڈینٹس سوسائٹی کے تعاون سے قائم کئے ہیں۔

۳۔ مسلم سوسائٹی فار پراپیگیشن اینڈ کلچر آف اسلام :- نام سے ظاہر ہے کہ اس تنظیم کا مقصد بھی اسلام کی دعوت و تبلیغ اور ان اشخاص کی اصلاح و تربیت ہے جو پولینڈ میں دعوت و تبلیغ کی ذمہ داری سنبھال سکیں۔

۴۔ مسلم اسٹوڈنٹ سوسائٹی :- اس تنظیم کے مقاصد بھی کم و بیش وہی ہیں جو اوپر کی تنظیموں کے ہیں۔ اس نے ۲۱ کتابیں شایع کیں اور متعدد اجتماعات بھی منعقد کئے، جن میں عام لوگوں سے خطاب کئے گئے، نوجوانوں کے لئے تربیتی کیمپ لگائے اور مدرسوں میں

تعلیم دینے کے لئے اساتذہ و معلمین مہیا کئے۔

یہ سرگرمیاں اندرون ملک ہی کے مسلمانوں کے چندے اور رضا کارانہ امداد پر ہوتوں ہیں

ایک اور اہم بات یہ قابل ذکر ہے کہ پولینڈ کی زبان میں قرآن مجید کا ایک ترجمہ یہاں کے ایک تاتاری امام نے ۱۹ ویں صدی عیسوی میں کیا تھا نامکمل تھا، اس کو ایک غیر مسلم نے مکمل کیا، باقی دو ترجمے جوزف بیلاسکی اور احمد بجار کے ہیں۔

حدیث میں صرف امام نووی کی اربعین کا ترجمہ ہوا ہے جس کی اشاعت مسلم اسٹوڈنٹ سوسائٹی نے کی ہے، اس اجمالی کیفیت سے گو پولینڈ میں اسلام کے احیار کی نوید ملتی ہے۔ لیکن انہیں دوسرے اسلامی ملکوں اور مسلم تنظیموں کی امداد و تعاون کی سخت ضرورت ہے۔

(ماخوذ از "دعوہ" اکتوبر ۲۰۰۰ء اسلام آباد پاکستان)

وفیات

جناب ریاض الدین احمد صاحب

علمی اور تعلیمی حلقوں میں جناب ریاض الدین احمد صاحب کی وفات سے جو خلا ہوا ہے اس قحط الرجال میں اس کا پُر ہونا مشکل ہے۔ ان کا اصل وطن غازی پور تھا، لیکن وہ الٰہ آباد میں متوطن ہو گئے تھے۔ انہوں نے مجیدیہ اسلامیہ انٹر کالج کے نیک نام اور کامیاب پرنسپل کی حیثیت سے بڑی شہرت و عزت حاصل کی، وہ طلبہ کی ذہنی و دماغی اور علمی تربیت بڑی دلسوزی سے کرتے تھے، ان کے زمانے میں کالج کا معیار تعلیم بہت بلند تھا، ان سے فیض حاصل کرنے والے طلبہ کی تعداد بے شمار ہے۔

ریاض الدین احمد صاحب کا خاص مشغلہ درس و تدریس تھا لیکن انہیں علم سے شغف اور تحریر و تصنیف کا اچھا ذوق تھا، طلبہ کی درسیات کے لئے متعدد کتابیں لکھیں جو مقبول ہوئیں، سائنس ان کا خاص موضوع تھا، اس پر جو کتابیں لکھیں وہ مدارس کے طلبہ کے لئے خاص طور پر بڑی مفید ہیں، قرآن مجید کے درس و تعلیم کا اچھا منصوبہ بنایا تھا۔ ان میں بڑی دینی و ملی غیرت تھی، مسلمان بچوں کو اپنے عقیدہ و مذہب پر استوار اور ملی شناخت باقی رکھنے کے لئے انہوں نے ایمانی پرائمر وغیرہ کے نام سے کئی مفید کتابیں لکھیں۔

قدرت نے انہیں دردمند دل اور بے چین طبیعت عطا کی تھی، وہ قوم و ملت کی فلاح کے ہر کام میں پیش پیش اور مسلمانوں کی ترقی و سربلندی کے لئے برابر فکرمند رہتے، مجلس مشاورت اور دینی تعلیمی کونسل سے شروع ہی سے وابستہ رہے، دینی تعلیمی کونسل کے جلسوں اور کانفرنسوں میں دلچسپی سے شریک ہوتے تھے، ایک دفعہ اس کی ایک بڑی کانفرنس اعظم گڑھ میں ان کی

صدارت میں ہوئی، ان کا خطبہ صدارت اور قاضی محمد عدیل عباسی کی اہم تقریر کو لوگوں نے بہت پسند کیا۔ وہ اقلیتی تعلیمی اداروں کی ایسوسی ایشن کے عرصے تک جنرل سکریٹری رہے اور اب اس کے نائب صدر تھے۔

مرحوم کی عمر نوے (۹۰) برس کی تھی، ان کے ایک بیٹے ڈاکٹر انور عبداللہ امریکہ میں تھے جن کے یہاں آتے جاتے رہتے تھے، اِدھر چند ماہ سے ان کے پاس امریکہ کے شہر رچمنڈ میں مقیم تھے، وہیں ۱۵ فروری ۲۰۰۱ء کو داعی اجل کا پیغام آگیا اور دین و ملت کا یہ بے لوث خادم ہمیشہ کے لئے رخصت ہوگیا، اللہ تعالیٰ غریقِ رحمت کرے اور اعزہ و متعلقین کو صبر و شکیب عطا کرے۔ آمین !!

پروفیسر محمد یونس نگرامی ندوی

یہ خبر سُن کر بڑا صدمہ ہوا کہ ۴ مارچ کو پروفیسر محمد یونس نگرامی کا انتقال ہوگیا، اِنَّا لِلّٰہِ وَاِنَّا اِلَیْہِ رَاجِعُوْنَ۔ اِدھر مہینوں سے ملاقات نہیں ہوئی تھی، لکھنؤ آنے جانے والوں سے ان کی علالت کی خبر ملتی تھی مگر یہ خیال نہیں تھا کہ وہ اتنی جلد رخت سفر باندھ لیں گے۔

ان کی پیدائش لکھنؤ ضلع کے مردم خیز قصبہ نگرام میں ۱۹۴۱ء میں ہوئی تھی، ان کا خاندان علمی و دینی حیثیت سے ممتاز تھا، درس و تدریس، تالیف و تصنیف اور وعظ و ارشاد اس کا طرۂ امتیاز تھا۔ ان کے والد مولانا محمد اویس نگرامی ندوی دارالعلوم ندوۃ العلماء لکھنؤ میں شیخ التفسیر تھے۔ وہ دارالمصنفین کے رفیق اور مولانا سید سلیمان ندویؒ کے محبوب تلامذہ میں تھے، ان کی صحبت میں مولانا کے تفسیر و قرآنیات کے ذوق کو بڑی جلا ملی، بعد میں وہ دارالمصنفین کی مجلس انتظامی کے رکن بھی ہوئے۔

پروفیسر محمد یونس نگرامی نے اپنے والد ماجد کے زیر سایہ دارالعلوم ندوۃ العلماء میں تعلیم پائی، پھر جامعہ اسلامیہ مدینہ منورہ گئے، لکھنؤ یونیورسٹی سے پی۔ ایچ ڈی کی ڈگری لی، پہلے

یونیورسٹی کے شعبہ عربی میں لکچرر اور اب کئی برس سے پروفیسر ہوگئے تھے۔

ان کا تحقیقی مقالہ "ہندوستان میں عربی زبان و ادب" کے موضوع پر تھا، ان کی دوسری کتب و رسائل کے نام یہ ہیں۔ تھوڑی دیر اہل حق کے ساتھ، خیالات، مثالی خواتین، نماز کیسے پڑھیں، تذکرہ مولانا محمد اویس نگرامی، تقدس حج، خلیجی جنگ وغیرہ۔

ندوہ اور جامعہ اسلامیہ مدینہ منورہ میں تعلیم پانے کی وجہ سے عربی لکھنے کی ان کو اچھی مشق ہوگئی تھی، ندوۃ العلماء کے جریدہ الرائد میں "نافذۃ علی الہند" (ہندوستان کے دریچے سے) کا مستقل کالم ان ہی کے قلم سے ہوتا تھا، البعث الاسلامی میں بھی ان کے مضامین چھپتے تھے، ان کی عربی زبان و ادب کی خدمات کے اعتراف میں انہیں ۱۹۹۲ء میں صدارتی ایوارڈ تفویض کیا گیا تھا۔

لکھنؤ کے اکثر علمی و تعلیمی اداروں کے رکن تھے اور ندوۃ العلماء کی مجلس انتظامی کے بڑے سرگرم ممبر تھے، ان کا حلقہ اثر بڑا وسیع تھا، علماء و مشائخ سے بھی تعلق رکھتے تھے اور قومی و سیاسی رہنماؤں سے بھی۔ مولانا علی میاںؒ سے برابر عقیدت مندانہ تعلق رہا۔ ان کے اثر و رسوخ سے دوسروں کو بھی فائدہ پہنچتا تھا۔

وہ دو (۲) بار اترپردیش اردو اکاڈمی کے چیرمین رہے، اس زمانے میں انہوں نے اردو زبان کی ترویج و اشاعت کے لئے متعدد شبینہ اسکول قائم کئے، ان سے قبل اکاڈمی کے سمینار اور انعامات ایک خاص طرح کے ادیبوں اور یونیورسٹی کے اساتذہ ہی کے لئے مخصوص رہتے تھے، مگر انہوں نے اکاڈمی کا سب سے بڑا ایوارڈ مولانا سید ابوالحسن علی ندویؒ کو دلایا، اسی طرح مولانا عبدالماجد دریابادی اور مولانا حکیم سید عبدالحئیؒ پر سمینار کرایا اور نکتہ چینیوں کی پروا نہیں کی۔

پروفیسر محمد یونس نگرامی کی شہرت ہندوستان ہی تک محدود نہیں تھی، وہ دنیائے اسلام میں

بھی متعارف تھے، رابطہ عالم اسلامی نے ہندوستان میں ان کو اپنا مشیر بنایا، اس کی وجہ سے انہوں نے کئی اسلامی ممالک اور کولمبو، ٹوکیو، لندن اور امریکہ کے سفر کئے۔

آل انڈیا مسلم انٹلکچول قائم کیا، جس کے زیر اہتمام انہوں نے حرمین شریفین کے تحفظ و تقدس، مسجد اقصیٰ کی بازیابی اور کویت پر عراق کے حملے کی مذمت کے لئے سیمنار کرائے۔

ان کی سفارش پر رابطہ عالم اسلامی کی جانب سے متعدد لوگوں کو حج و زیارت کی سعادت نصیب ہوئی، اس ناچیز سے بھی وہ بڑا تعلق رکھتے تھے اور ان ہی کی بدولت مجھے بھی یہ زریں موقع ملا۔

ع گزر چکی ہے یہ فصل بہار ہم پر بھی۔

پروفیسر یونس نگرامی کے خاندان میں وعظ و ارشاد، اصلاح معاشرت، شرک و بدعت اور غلط رسموں کے انسداد کے لئے جو کوششیں عرصے سے ہو رہی تھیں انہوں نے بھی اس روایت کو باقی رکھا، بعض نئے مدارس و مکاتب قائم کئے اور بعض پرانے مدرسوں کو نئی زندگی بخشی، وہ اصلاحِ معاشرت کے جلسوں میں بھی شریک ہوتے اور اس کے لئے لکھنؤ، سلطان پور، بارہ بنکی اور رائے بریلی کے ان گاؤں کا سفر کرتے جہاں ان کے والد مرحوم جایا کرتے تھے۔

پروفیسر محمد یونس صاحب بڑے متحرک اور فعال آدمی تھے، ابھی ان کی عمر زیادہ نہیں تھی مگر انہوں نے بہت سے مفید اور اہم کام انجام دیے، ان سے بڑی توقعات وابستہ تھیں، مگر خدا کی مشیت و مصلحت سب پر غالب ہے۔ اللہ تعالیٰ انہیں جنت نعیم اور پس ماندگان کو صبر جمیل عطا کرے۔ آمین!!

"ض"

باب التقریظ والانتقاد

تدبر حدیث (جلد اول)

شرح موطا امام مالکؒ

از ضیاء الدین اصلاحی

ترتیب و تدوین: جناب خالد مسعود و سعید احمد صاحبان، تقطیع کلاں، کاغذ، کتابت و طباعت عمدہ، صفحات ۴۴۴، مجلد ہدیہ ۳۵۰ روپئے، پتے: (۱) ادارہ تدبر قرآن و حدیث، رحمن اسٹریٹ، مسلم موڈ، سمن آباد۔ لاہور (۲) دار التذکیر رحمن مارکیٹ، غزنی اسٹریٹ، اردو بازار لاہور۔

برصغیر کے مشہور و ممتاز عالم مولانا امین احسن اصلاحیؒ کی نظر قرآن مجید کی طرح حدیث نبویؐ پر بھی گہری تھی، چنانچہ تدبر قرآن کی تکمیل کے بعد تدبر حدیث کا سلسلہ شروع کیا، لیکن ناتوانی اور پیرانہ سالی کی بنا پر تحریر و تصنیف کے بجائے اس کام کا آغاز درس سے کیا اور پہلے اصول حدیث پر لکچر دئے جو عرصہ ہوا "مبادی تدبر حدیث" کے نام سے شائع ہوئے پھر شاہ ولی اللہ صاحبؒ کی تقسیم کے مطابق طبقہ اولیٰ کی کتابوں کے درس و تعلیم کا پروگرام بنایا، جن میں اولیت موطا امام مالکؒ کو دی جو حدیث نبویؐ کے علاوہ آثار و فتاوائے صحابہ و تابعین اور فقہائے مدینہ کے آراء و اجتہادات کا اہم مجموعہ ہے اور جس کو شاہ صاحبؒ ہی کی طرح مولانا اور ان کے استاذ امام مولانا حمید الدین فراہیؒ کے نزدیک احادیث کی کتابوں پر مزیت حاصل ہے۔

مولانا کے تلامذہ و رفقا نے ان کے امالی کو ٹیپ کر کے بعد میں تحریری شکل میں مرتب کیا اور وہ ان کے ملاحظہ کے بعد پہلے رسالہ تدبر میں شایع ہوئے اور اب انہیں کتابی صورت میں شایع کیا جارہا ہے۔

زیر نظر کتاب اس کی پہلی جلد ہے، جو موطا کے منتخب ابواب کی شرح ہے، اس کے ابواب یہ ہیں:

کتاب الزکوۃ۔ کتاب البیوع۔ کتاب القراض۔ کتاب المساقاۃ۔ کتاب کراء الارض۔ کتاب الشفعہ۔ کتاب الاقضیہ۔ کتاب الحدود۔ کتاب الاشربہ۔ کتاب العقول۔ کتاب القسامہ۔ کتاب الجامع (فضائل مدینہ۔ تقدیر۔ اخلاق۔ لباس۔ ظروف۔ ماکولات۔ سلام۔ نظر بد اور سحر وغیرہ)

شرح حدیث کا طریقہ یہ ہے کہ پہلے حدیث کی سند و متن نقل کر کے اس کا سلیس اور مطلب خیز ترجمہ کیا گیا ہے، پھر اس کی وضاحت کر کے اس کا اصل منشا و مدعا بتایا گیا ہے، اس ضمن میں مشکل الفاظ کی تحقیق، اس مفہوم کی دوسری روایات سے اس کے مطالب کی تبیین، دوسری کتابوں کی روایتوں سے اس کے طرق کی توثیق و تعیین یا زیر بحث حدیث سے روایتاً، معناً اور ترتیباً ان کا فرق دکھایا گیا ہے۔ روایت سے مستنبط احکام و مسائل کا تذکرہ خاص طور پر کیا گیا ہے اور ان کے متعلق ائمہ و مجتہدین کے آرا و اقوال اور مختلف مسالک میں محاکمہ کر کے اپنی ترجیح دلائل کے ساتھ پیش کی ہے۔

مولانا نے زرقانی اور حضرت شاہ ولی اللہؒ کی شرحوں سے زیادہ استفادہ کیا ہے اور دور حاضر کے بعض باخبر اور صاحب علم و نظر مصنفین کی آرا و تحقیقات کا ذکر بھی کیا ہے، جیسے اوزان اور پیمانوں کی تحقیق میں ڈاکٹر یوسف قرضاوی کے حوالے دئے ہیں۔

موطا امام مالکؒ کی اس نئی شرح کی اہم خصوصیت یہ ہے کہ چونکہ مولانا کے نزدیک اصل کسوٹی قرآن مجید ہے اس لئے روایات کے رد و قبول میں انہوں نے اسی کو معیار بنایا ہے اور جا بجا ان کی شرح میں اس سے استشہاد بھی کیا ہے مثلاً مسئلہ تقدیر کی بحث میں رقم طراز ہیں:

"اس کے ماننے والے اس کی تعبیر اس طریقہ سے کر دیتے ہیں کہ جس سے آدمی کی بدی اور گمراہی کا الزام بھی اللہ تعالیٰ پر آتا ہے، ان کے نزدیک ہر فعل کا خالق اللہ تعالیٰ ہے جب کہ قرآن مجید میں ہے کہ

فَاَمَّا مَنْ اَعْطٰى وَاتَّقٰى وَصَدَّقَ بِالْحُسْنٰى فَسَنُيَسِّرُهٗ لِلْيُسْرٰى وَاَمَّا مَنْۢ بَخِلَ وَاسْتَغْنٰى وَكَذَّبَ بِالْحُسْنٰى فَسَنُيَسِّرُهٗ لِلْعُسْرٰى۔ اس سے معلوم ہوا کہ جتنی نیکیاں انسان کرتا ہے ان کی توفیق اللہ تعالیٰ دیتا ہے اور جتنی برائیوں کا وہ ارتکاب کرتا ہے ان کو بھی وہ اس وقت تک نہیں کر سکتا جب تک کہ اللہ کی طرف سے اس کو ڈھیل نہ ملے، کسی عمل کی توفیق ملنے اور ڈھیل حاصل ہونے میں اور خدا کے اس عمل کا خالق ہونے میں جو فرق ہے وہ نہایت واضح ہے۔" (ص ۳۳۸)

وہ ایک حدیث کی شرح کرتے ہوئے اس نوعیت کی دوسری حدیثوں کو بھی سامنے رکھتے ہیں تاکہ اس میں جو خفا و ابہام ہو اسے دور کر دیں، مثلاً ایک حدیث میں عہد فطرت سے متعلق آیت (وَاِذْ اَخَذَ رَبُّكَ مِنْۢ بَنِيْٓ اٰدَمَ الخ) کی تشریح میں لکھتے ہیں

"اس کی وضاحت میں قرآن مجید میں مفصل بحثیں ملتی ہیں، اس کے برعکس اس روایت میں یہ تو بتایا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے جہنم کے لئے ان لوگوں کو پیدا کیا جو جہنمیوں کے کام کریں گے اور جنت کے لئے ان لوگوں کو پیدا کیا جو جنتیوں کے عمل کریں گے، لیکن اس اہم حقیقت کا بیان اس میں نہیں ہے کہ جنت اور جہنم کا سامان وہ قدرت کی طرف سے عطا کردہ قوتوں اور صلاحیتوں کے صحیح یا غلط استعمال کے نتیجہ میں کریں گے لہذا روایت ناتمام معلوم ہوتی ہے اور یہ تاثر دیتی ہے جیسے انسانوں کو پہلے ہی سے جنتی یا جہنمی بنا کر دنیا میں بھیج دیا گیا ہے، صحیح مسلم میں اس ضمن کی بہت سی روایتیں جمع کی گئی ہیں لیکن زیر بحث روایت اس میں نہیں لی گئی جب کہ دیگر روایات میں صورت واقعہ نہایت واضح طور پر بیان ہوئی ہے۔" (ص ۳۳۴)

مولانا امین احسن اصلاحی کو عربیت میں درخور تھا اور وہ اس زبان کے مزاج آشنا اور اس کے اسالیب سے واقف تھے، اسی لئے وہ اکثر روایات کو بالمعنی بتاتے ہیں، کیونکہ ان میں عربیت کا وہ انداز مفقود ہے جو کلام نبوت کا طغرائے امتیاز ہے۔ بعض روایتوں میں عربی زبان کے اسلوب کے

مطابق حذف و اختصار ہوتا ہے اور تفصیل چھوڑ دی جاتی ہے جس کو سمجھنا عربیت سے ناآشنا لوگوں کے لئے مشکل ہے، ایسے موقعوں پر مولانا نے موقع و محل کی رعایت سے حذف کو کھول دیا ہے تاکہ ابہام و اشتباہ رفع ہوجائے مثلاً ایک حدیث میں ہے کہ حضرت حفصہؓ نے ایک لونڈی کو جس نے ان پر سحر کردیا تھا قتل کردیا، اس لونڈی کو انہوں نے مدبّر[1] کررکھا تھا، مولانا فرماتے ہیں:

"حضرت حفصہؓ خود تو قتل نہیں کرسکتیں، انہوں نے قاضی یا حاکم کے آگے معاملہ پیش کیا ہوگا جس نے تحقیق کرکے قتل کا حکم دیا ہوگا، راوی صاحب نے یہ واقعہ بیان کرنے میں معاملہ کی تفصیلات لپیٹ دی ہیں، میں نے بہت سی روایات دیکھی ہیں جن میں راوی حضرات اس طرح کی بے احتیاطی کرجاتے ہیں، ایسی روایات کو موقع کے لحاظ سے سمجھنا چاہیے۔" (ص۲۹۴)

ایک حدیث میں ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے جو آخری ارشادات فرمائے ہیں ان میں یہ بھی تھا کہ "اللہ تعالیٰ یہود و نصاریٰ پر لعنت کرے کہ انہوں نے اپنے نبیوں کی قبروں کو معبد بنالیا. عرب کی سرزمین میں دو دین باقی نہیں رہیں گے"۔ مولانا حدیث کے دونوں حصوں کی بے ربطی کی نشاندہی کرتے ہوئے لکھتے ہیں ،

"حدیث کے یہ دونوں ٹکڑے معنوی طور پر کچھ بے ربط سے ہیں، اس کی وجہ یہ ہے کہ بیچ میں کچھ باتیں حذف کردی گئی ہیں، موقع کی بات جو حضرت عمر بن عبدالعزیزؒ نے فرمائی تو اس میں صرف دو باتوں کا ذکر کیا ہے۔" (ص۳۲۱)

راویوں کے موقع و محل متعین نہ کرنے کی شکایت بھی کی ہے جیسے ایک روایت میں ہے کہ "بخار جہنم کی پھونک میں سے ہے، اسے پانی سے بجھاؤ"۔ مولانا اس کے متعلق تحریر فرماتے ہیں:

"روایت سے یہ معلوم نہیں ہوتا کہ آنحضرتؐ نے یہ بات کس موقع پر فرمائی، ہوسکتا ہے

---

[1] یعنی اس سے کہا تھا کہ میری وفات کے بعد تم آزاد ہوجاؤ گی۔

بخار کی کوئی خاص قسم مراد ہو یا کسی کے بخار کا ذکر آیا ہو اور آپ کو معلوم ہو کہ اس کو لو لگی ہے تو اس موقع پر آپ نے فرمایا ہو، بہت سی روایات کو سمجھنے میں لوگوں کو مشکل اس لئے پیش آئی کہ راوی حضرات روایت کا موقع و محل متعین نہیں کرتے، اس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ بڑے بڑے فتنے اٹھ کھڑے ہوتے ہیں۔" (ص۴۲۵)

بعض روایتوں کے مضامین پر بھی شک اور بے اطمینانی ظاہر کی ہے مثلاً آپؐ نے فرمایا "دو فریق جب کوئی معاملہ کرچکیں تو اختلاف کی صورت میں بائع کا قول معتبر ہوگا یا پھر وہ دونوں بیع فسخ کردیں"۔ مولانا فرماتے ہیں:

"یہ روایت بہت مبہم ہے، اس میں یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ بیع ہوچکنے کے بعد اختلاف کی صورت میں خالی بائع کا قول کیوں معتبر ہوگا، مشتری کا موقف بھی تو درست ہوسکتا ہے، آگے امام مالکؒ نے اپنا ایک فتویٰ نقل کیا ہے جس سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ بھی اس روایت کے مضمون سے مطمئن نہیں۔" (ص۱۲۴)

فتاویٰ میں وقت اور حالات کا خیال ضروری ہے، بیع المرابحہ کے تعلق سے امام مالکؒ کا ایک فتویٰ ہے کہ "ہمارے ہاں یہ بات متفق علیہ ہے کہ اگر کسی شخص نے ایک شہر میں کپڑا خریدا پھر وہ اس کو لے کر دوسرے شہر میں آیا اور وہ کپڑا نفع پر بیچتا ہے تو وہ اس کی قیمت، دلالوں کی اجرت، کپڑا تہہ کرنے اور لادنے کا خرچہ اور ٹھہرنے کی جگہ کا کرایہ وغیرہ شمار نہیں کرسکتا، صرف باربرداری کا خرچہ شامل کرسکتا ہے"۔ مولانا اس پر تبصرہ کرتے ہوئے رقم طراز ہیں:

"میرے خیال میں یہ فتویٰ اس زمانے میں نہیں چل سکتا، ہر چیز کا خرچہ جو اس سے متعلق ہوگا وہ شمار کرنا پڑے گا، آج کل ٹیلی فون کا خرچہ، دفتر کے اخراجات اور ہوٹل کا کرایہ وغیرہ سب خرچ میں شامل کرنے کے بعد منافع کا تعین ہوسکے گا، میری رائے میں اس زمانے میں تجارت کے جو

اصول ہیں اور جن پر معاملات قائم ہیں وہ بالکل فطری ہیں"۔ (ص ۱۲۱و۱۲۲)

شرابی کی حد کے بارے میں صحابہ کے مختلف اقوال نقل کرکے لکھتے ہیں:

"گویا شرابی کی سزا کا معاملہ حد کا نہیں بلکہ تعزیر کا ہے، اللہ تعالیٰ اور نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے کوئی حد مقرر نہیں فرمائی، ان کے سوا کوئی دوسرا حد مقرر نہیں کر سکتا، تعزیر کا معاملہ اجتہادی ہے، امیر اپنی رائے یا مشاورت سے حالات کے مطابق سزا دے سکتا ہے، فقہا حالات کے مطابق جو فیصلہ کریں وہ کر سکتے ہیں"۔ (ص ۲۵)

امام مالکؒ نے مرتد کے مسئلے میں یہ روایت نقل کی ہے کہ حضرت عمرؓ کے پاس حضرت ابو موسیٰ اشعری کے ہاں سے ایک شخص آیا تو انہوں نے پوچھا کیا کوئی اہم خبر ہے، اس نے کہا ہاں ایک شخص نے اسلام لانے کے بعد کفر کیا تھا، حضرت عمرؓ نے فرمایا تو آپ لوگوں نے اس کے ساتھ کیا کیا؟ اس شخص نے کہا کہ ہم نے اس کو پکڑا اور گردن مار دی، حضرت عمرؓ نے کہا کہ آپ لوگوں نے اس کو تین دن کے لئے گرفتار کر لیا ہوتا، اس کو ہر روز ایک چپاتی کھانے کو دیتے اور اس سے توبہ کا مطالبہ کرتے، شاید وہ توبہ کرتا اور اللہ کے امر کی طرف لوٹتا، پھر حضرت عمرؓ نے فرمایا اے اللہ نہ میں اس موقع پر موجود تھا، نہ میں نے حکم دیا اور نہ میں اس پر راضی ہوا جب مجھے اطلاع ملی"۔

اس کے متعلق مولانا لکھتے ہیں:

"اس روایت سے معلوم ہوتا ہے کہ توبہ کا مطالبہ ضروری ہے اور اس کے لئے کم از کم تین (۳) دن کی مہلت ہونی چاہئے، امیر کی صواب دید پر زیادہ دن کی مہلت بھی دی جاسکتی ہے، امام مالکؒ نے پچھلی روایت میں توبہ کی گنجائش بھی نہیں رکھی اور اس کی وجہ بیان کر دی ہے، دراصل ارتداد کی نوعیتیں مختلف ہیں اور ہر ایک شخص کا معاملہ مختلف ہوتا ہے، امیر معاملہ کی نوعیت اور شخص کے خاص حالات کو ملحوظ رکھ کر فیصلہ کرے گا"۔ (ص ۱۷۰)

وہ فقہا کے اس اصول پر بھی معترض ہیں:

"ہمارے فقہا نے ایک اصول یہ بنا رکھا ہے کہ صحابہ کے بعد کوئی شخص عدول نہیں اور جس شخص کا عدول ہونا معلوم نہ ہو اس کی گواہی نہیں لی جائے گی، میرے خیال میں یہ اصول صحیح نہیں، اصول یہ ہونا چاہئے کہ آپ اگر کسی شخص کے خلاف کوئی جرم ثابت نہیں کر سکتے، کوئی تہمت نہیں لا سکتے تو وہ عدول مانا جائے گا، خواہ وہ عالم ہو یا جاہل اور وہ کسی بھی فرقے سے تعلق رکھتا ہو، عدالتی معاملات میں وہ عدول سمجھا جائے گا الا یہ کہ آپ اس کے خلاف کوئی الزام ثابت کر دیں"۔ (ص ۱۵۶)

روایتوں کے مدلول پر عصر جدید کے مسائل کو منطبق کرنے کی کوشش بھی کی گئی ہے مثلاً ماشیہ (جانوروں) کی زکوٰۃ کے سلسلے میں لکھتے ہیں:

"پولٹری کے جانور، گھوڑے اور خچر طرح طرح کے پرندے مثلاً کبوتر، طوطے اور بٹیر غرضیکہ جو جانور بھی تجارت کے لئے پالے جاتے ہیں ان پر مقررہ مقدار کو چھوڑ کر زکوٰۃ ہوگی اور یہ ماشیہ کے مفہوم میں سمجھے جائیں گے"۔ (ص ۲۶)

معدنیات کی زکوٰۃ کے متعلق لکھتے ہیں:

"مثال کے طور پر تیل کا کنواں کھودا جارہا ہے، ممکن ہے تیل مل جائے لیکن اس کا بھی قوی امکان ہے کہ تیل نہ ملے تو یہ رکاز کے حکم میں نہ ہوگا بلکہ معادن میں شامل ہوگا، اس کے برعکس اگر دیوار کے لئے کھدائی کی جارہی ہو اور زمین میں سے اشرفیوں کا صندوق نکل آئے جو بغیر اہتمام کے مل جائے تو یہ دفینہ کے حکم میں ہوگا، اس میں سے پانچواں حصہ زکوٰۃ کی مد میں لے لیا جائے گا"۔ (ص ۳۲)

ایک روایت میں سب سے بہتر گواہ اس کو کہا گیا ہے جو سوال کئے جانے سے قبل ہی اپنی گواہی

پیش کر دے، اس کے متعلق لکھتے ہیں :

"اس امت کا فریضہ منصبی شہداء اللہ فی الارض کا ہے جیسا کہ سورۂ بقرہ کی آیت ۱۴۳ میں ہے لتکونوا شہداء علی الناس، یہ حق کی گواہی دینے والی امت ہے، اس فریضہ منصبی کا تقاضا یہ ہے کہ امت کے افراد کا اجتماعی مزاج یہ ہو کہ آدمی کسی مظلوم کی حق تلفی ہوتے دیکھ کر خود بول پڑے کہ میں جانتا ہوں کہ اس بے چارے کا حق ہے مگر اس کو اس کے حق سے محروم کیا جا رہا ہے، اس سے بحث نہ ہو کہ عدالت اس کو طلب کرتی ہے یا نہیں، وہ ہزاروں کے سامنے بھی اپنی گواہی پیش کرنے کے لئے تیار رہے، آج ہمارا مزاج یہ ہو گیا ہے کہ گواہی بکتی ہے پیشہ ور گواہ عدالتوں میں موجود ہوتے ہیں، آپ کا کوئی مقدمہ ہو وہ گواہی دینے کے لئے حاضر رہتے ہیں، یہ بد معاشی ہے، ایسے لوگ اس امت کے فرض منصبی کی مخالفت کرنے والے ہیں" (صد ۲۰۱)

امام مالکؒ کے زمانے میں دینار و درہم مسکوک بھی ہوتے تھے اور غیر مسکوک بھی، اس لئے ان کے وزن میں معیاری وزن کے لحاظ سے فرق ہوتا تھا، امام صاحب کا فتویٰ یہ تھا کہ اگر بیس دینار اور دو سو درہم تعداد صحیح ہونے کے باوجود وزن میں پورے نہ اتریں تو ان پر زکوۃ نہیں ہوگی گویا اصل معیار سونا یا چاندی کی مقدار ہے، سکوں کی تعداد نہیں۔ اس زمانہ میں دینار و درہم کا مبادلہ بھی ہر جگہ ایک جیسا نہ ہوتا تھا، امام مالکؒ کا فتویٰ یہ تھا کہ اگر کسی مقام پر بیس دینار ایک سو ساٹھ درہم کے برابر ہوتے ہوں تو ان پر زکوۃ نہیں ہوگی، مولانا اس تفصیل کے بعد لکھتے ہیں :

"گویا امام صاحب چاندی کو سٹینڈرڈ مانتے تھے، کاغذ کرنسی کے اس دور میں اب یہ مسائل پیدا نہیں ہوتے" (صد ۲۹)

ایک جگہ کھیتی کے بارے میں حنفیہ کی شرط قوت (غذا بننے) اور ذخیرہ کرنے کی صلاحیت کا تذکرہ کرنے کے بعد لکھتے ہیں

"اس زمانے میں غلوں کے علاوہ دوسری اجناس مثلاً پیاز، لہسن، سردہ، گرما وغیرہ سے بھی زیادہ نقد آور ہو گئی ہیں، زکوۃ اصلاً چونکہ اموال پر عاید ہوتی ہے، اس لئے کوئی وجہ نہیں کہ اسلامی حکومت گنے پر، تمباکو، سبزیوں اور پھلوں اور ایسی تمام اجناس پر زکوۃ وصول نہ کرے جو آج آمدنی کا اہم ذریعہ ہیں، میرے نزدیک اصول یہ ہے کہ کھیتی میں جو کچھ بھی ہے، اس پر زکوۃ ہے، بشرطیکہ مقدار اتنی ہو کہ صدقہ لینے والا اس میں مداخلت کر سکے" (صد ۲۵)

موطا راویان صحاح کے مشہور راوی محمد بن شہاب زہری بعض اہل علم کی تنقید کا نشانہ رہے ہیں جمہور محدثین کے نزدیک ابن شہاب پر ان کا اعتراض پسندیدہ نہیں، مولانا امین احسن صاحب نے بھی ان پر اور ان کی روایات پر طعن کیا ہے، وہ ان کے سلسلے میں امام دار الہجرت کے ایک مالوف قاعدے کا ذکر کرتے ہیں، حالانکہ یہ کوئی عام قاعدہ نہیں بلکہ اکثر جگہ امام صاحب نے کسی پردے کے بغیر ان کا نام صراحتاً لیا ہے۔ راقم کے نزدیک رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے سوا کوئی تنقید سے بالاتر نہیں، تاہم مولانا کا انداز بیان نامناسب بلکہ جارحانہ ہے اور چونکہ اس زد میں امام مالکؒ اور دوسرے کبار محدثین بھی آگئے ہیں اس لئے اس سے ذخیرۂ احادیث پر بے اعتمادی کا اندیشہ بھی ہے چند مثالیں پیش ہیں :

"اس روایت کی سند میں عن مالک عن الثقۃ عندہ کے الفاظ بھی قابل غور ہیں، امام مالکؒ نے موطا میں جو روایات لی ہیں ان میں کثیر روایات کی سند میں عمن اثق بہ (اس شخص سے جس پر مجھے اعتماد ہے) عن الثقۃ عندنا (اس شخص سے جو ہمارے نزدیک قابل اعتماد ہے) کے الفاظ آتے ہیں، عام حالات میں اگر کوئی محدث سند کے کسی راوی کو چھپائے تو اس کی روایت مجروح قرار دی جاتی ہے لیکن امام مالکؒ چونکہ بڑے عالی مقام محدث ہیں، اس لئے ان کی زیادتی برداشت کر لی جاتی ہے کہ وہ اپنے راوی کی شخصیت کا اظہار نہ کریں، پہلے تو

میں بھی اس چیز کو نظر انداز کرتا رہا لیکن بعض روایات پڑھنے سے میرا اعتماد سخت مجروح ہوا۔

شارحین کی رائے یہ ہے کہ اکثر مواقع پر الثقۃ عندنا سے امام مالک کی مراد ابن شہاب زہری ہوتے ہیں جن کے بارے میں معلوم ہوتا ہے اسی زمانے میں دو رائیں پائی جاتی تھیں بعض لوگ ان پر اعتماد کرتے تھے لیکن دوسرے ان کے بارے میں اچھی رائے نہیں رکھتے تھے، امام مالکؒ چونکہ جرح و تعدیل میں بھی اپنی رائے رکھتے ہیں اس لئے بڑے طنطنے سے کہتے ہیں کہ میں ان پر اعتماد کرتا ہوں، دوسرا کوئی نہیں کرتا تو نہ کرے ایک متنازعہ فیہ شخصیت کے حق میں اس طرح کا اصرار امام صاحبؒ کی بڑی زیادتی ہے۔ زہری کا تشیع اور مرسل روایت کا ان کے ہاں انبار ان کو اس قابل نہیں چھوڑتا کہ امام صاحبؒ ان کے حق میں دھونس سے کام لیں، آپ آگے دیکھیں گے کہ زہری نے نہایت خطرناک روایتیں بیان کی ہیں اور امام صاحبؒ نے ان کو قبول کر لیا ہے۔" (ص۳)

ایک روایت ہے کہ ایک عورت کو چھ ہی ماہ بعد بچہ پیدا ہوا، حضرت عثمانؓ نے اسے رجم کئے جانے کا حکم دیا مگر حضرت علیؓ نے [وحملہ وفصالہ ثلاثون شھرا] کی رو سے کہا اس پر رجم نہیں، حضرت عثمانؓ نے آدمی بھیج کر روکنا چاہا تو معلوم ہوا کہ وہ رجم کر دی گئی۔ مولانا ارشاد فرماتے ہیں:

"یہ روایت امام مالکؒ کی بلاغات میں سے ہے اور ان کی اکثر بلاغات وہ ہیں جن کے پیچھے ابن شہاب چھپے ہوتے ہیں، امام مالکؒ ان سے حسن ظن رکھتے تھے لیکن وہ یہ جانتے تھے کہ ابن شہاب پر شیعیت کا شبہ کیا جاتا ہے اس لئے وہ ان کو اپنی بلاغات کے پردے میں چھپا لیتے تھے، معلوم ہوتا ہے یہ روایت بھی حضرت عثمانؓ کے اوپر حضرت علیؓ کی فضیلت کی غرض سے گھڑی گئی ہے۔ یہ بات قابل یقین نہیں کہ حضرت عثمانؓ نے بغیر تحقیق کے محض ناواقفیت کی بنا پر ایک عورت کو رجم کرا دیں، یہ ابن شہاب کی شرارت ہے، جس کا

مقصد حضرت عثمانؓ کو بدنام کرنا ہے۔" (ص۲۲۶)

امام مالکؒ الوضوء من العین کے باب میں دو روایتیں لائے ہیں، مولانا ان کی وضاحت میں لکھتے ہیں:

"اگرچہ دونوں روایتیں ایک ہی واقعہ کو بیان کرتی ہیں لیکن ان میں بڑا فرق میرے نزدیک اس وجہ سے پیدا ہو گیا کہ پہلی روایت کے راوی محمد بن ابی امامہ ہیں جب کہ دوسری محمد بن شہاب زہری سے مروی ہے۔ پہلی روایت کے مطابق نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے عامر بن ربیعہ کو وضو کرنے کا حکم دیا اور سہل بن حنیف کے لئے برکت کی دعا کرنے کو کہا جس سے سہل اچھے ہو گئے، یہ بات قرین قیاس اور شریعت کے مزاج کے مطابق ہے دوسری روایت میں ابن شہاب نے اس کو ایک ٹوٹکا بنا کر پیش کیا ہے۔ ان کے کہنے کے مطابق جس آدمی سے نظر بد لگی ہو اس کو نہلایا جائے، تمام اعضاء حتی کہ زیر جامہ کے اعضاء کو بھی دھو کر پانی ایک برتن میں جمع کیا جائے اور وہ تمام کا تمام مریض کے اوپر ڈالا جائے تو نظر بد کا اثر ختم ہو جائے گا اور مریض تندرست ہو جائے گا، یہ سب اوہام ہیں ان کو حقیقت سے کوئی تعلق نہیں، زہری کے معاصر میں یہ بات بھی رہی ہے کہ یہود کے اعمال سفلی کو اسلام میں گھسایا جائے اور ایمان بالجبت (یا اعمال سفلیہ پر ایمان) یہود کی خصوصیت رہی ہے، ٹوٹنے ٹوٹکے وغیرہ سب جبت کے قبیل سے ہیں، روایت میں غسل کے اس طریقہ کے لئے شاہ ولی اللہؒ نے بھی لکھا ہے کہ یہ ابن شہاب کی اپنی گرہ ہے، وہ یہ فرماتے ہیں کہ ان باتوں سے عقل کا کوئی تعلق نہیں، ٹوٹنے ٹوٹکے دل سے مان لینے کی چیزیں ہیں، میرے نزدیک یہ قرآن کے خلاف اور یہود کے بقایا میں سے ہیں، صوفیوں کے ذریعہ ان کو فروغ حاصل ہوا ہے۔" (ص۲۷)

مشہور حدیث لا نورث ما ترکنا فھو صدقۃ کی وضاحت میں لکھتے ہیں:

"اس حدیث کے سلسلۂ روایت میں ابن شہاب زہری موجود ہیں، یہ اہل سنت کے بہت بڑے امام ہیں، وہ تمام امور جن میں اہل سنت اور شیعہ کے درمیان اختلاف ہے کسی نہ کسی طور پر ابن شہاب سے مروی ہیں مگر اس کے باوجود امام بخاریؒ اور امام مالکؒ نے ان کو سر پر اٹھایا ہے، یہ امت کے لئے بہت بڑا حادثہ ہے" (ص ۳۲)

سوال سے احتراز کے بارے میں ابن شہاب سے مروی ایک حدیث کی وضاحت میں لکھتے ہیں:

"یہ روایت ہے تو ابن شہاب کے ذریعے سے مگر نہایت لاجواب روایت ہے، فلسفۂ دین کے لحاظ سے یہ بہت اہم روایت ہے، بس ایسی ہی روایات کی بدولت ابن شہاب کو اہمیت حاصل ہوگئی ہے اور ان ہی کے پردے میں وہ اپنی خرافات بھی بھر دیتے ہیں" (ص ۳۳)

لا تحل الصدقۃ لآل محمد انما ھی اوساخ الناس (آل محمد کے لئے صدقہ جائز نہیں، یہ لوگوں کے جسموں کا میل کچیل ہے) کی وضاحت ملاحظہ ہو:

"یہ روایت امام مالکؒ کی بلاغات میں سے ہے، امام مالکؒ نے اس میں راوی کا نام نہیں لکھا مگر یہ یاد رکھئے کہ یہ روایت پانچ چھ طریقوں سے مرفوع ہے اور ان سب میں ابن شہاب موجود ہے۔ یہ روایت قرآن کے بالکل خلاف ہے اور عقل کے بھی خلاف ہے، میرے نزدیک اس کو شیعوں کے امام ابن شہاب نے گھڑا ہے تاکہ آل محمد کی برہمنیت کو قائم کیا جائے، پہلے میرا خیال یہ تھا کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ بات یوں فرمائی ہوگی کہ لا تحل الصدقۃ لآل محمد اور یہ فرمانے کی وجہ یہ ہی ہوگی کہ یہودیوں میں یہ ہوا تھا کہ صدقہ اور زکوٰۃ کی جتنی رقوم ہوتی تھیں وہ یہود کے قبیلہ بنی لاوی کا حق مان لی گئی تھیں۔ قربانی کے جتنے جانور ہوتے تھے ان کے گوشت کا بہترین حصہ ان کا حصہ ہوتا تھا اور خیرات کی تمام رقمیں ان کی ہوتی تھیں، دوسرے لوگ ان سے محروم کر دئے گئے، میرا خیال یہ تھا

کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے اس فتنہ کے سد باب کے لئے فرمادیا لا تحل الصدقۃ لآل محمد کہ آل محمد کے لئے صدقہ جائز نہیں۔ اس کے بعد روایت کا جتنا حصہ ہے وہ ابن شہاب کا اسی طرح کا اضافہ ہے جس طرح کا اضافہ انہوں نے پیچھے بیان ہونے والی العین حق (نظر بد ایک حقیقت ہے) کی روایت میں کیا ہے وہاں العین حق کی تاویل تو ہو سکتی ہے لیکن اس کے بعد نظر بد آنے کا جو ٹوٹکا ابن شہاب نے بتایا ہے کہ نظر لگانے والے شخص کو پکڑا جائے وہ اپنے تہمد کے نیچے کا حصہ دھوئے اور دھوون اس شخص پر انڈیل دی جائے جس کو نظر لگی ہو تو یہ ابن شہاب کا اپنا اضافہ ہے، لیکن اب میری رائے یہ ہے کہ یہ پوری روایت جھوٹی ہے، اس کی وجہ یہ ہے کہ اگر صدقہ اوساخ الناس (لوگوں کا میل کچیل) ہے تو یہ میل کچیل ان لوگوں کے لئے ہے جو مالدار ہیں اور لوگوں کا حق ادا نہیں کرتے، محتاج اور نادار اگر پاتے ہیں تو اپنا حق پاتے ہیں، یہ بات قرآن مجید سے ثابت ہے کہ یہ حق معلوم یعنی ان کا معین حق ہے، قرآن مجید میں یہ بتایا گیا ہے کہ لوگوں کے پاس جو زائد مال ہوتا ہے وہ اصل میں دوسروں کے حقوق ہیں جو امراء کی امانت میں دئے جاتے ہیں اور اس سے ان کا امتحان مقصود ہوتا ہے کہ وہ یہ حقوق ادا کرتے ہیں یا نہیں اگر وہ اس مال کو ہڑپ کریں تو وہ غلاظت کا ڈھیر ہے جو وہ کھا رہے ہیں مستحقین کے لئے یہ غلاظت کا ڈھیر نہیں بلکہ اللہ کا دیا ہوا مال ہے۔

پھر اس روایت میں آل محمد کو برہمنوں کی طرز کا ایک پورا خاندان بنا دیا گیا اور اس میں تمام بنی ہاشم کو شامل کر دیا گیا، تمام بنی ہاشم کے لئے صدقات حرام کر دئے اس کی وجہ یہ ہے کہ اوپر بیان کردہ روایت کی رو سے چونکہ الید العلیا (اوپر کا ہاتھ) افضل ہے اور الید السفلی (نیچے کا ہاتھ) مفضول ہے تو آل محمد کے لئے یہ کس طرح جائز ہوتا کہ ان کا

ہاتھ نیچے رہے، چاہے وہ غریب ہوں یا امیر۔ ان کو تو بہر حال سر پر بیٹھنا ہے، وہ نیچے کس طریقہ سے اتر سکتے ہیں۔

پھر یہ سوال بھی اہم ہے کہ تمام بنی ہاشم کس طریقہ سے آل محمد میں شامل ہو گئے، پیدا تو یہ ہے کہ عرب میں اور ہمارے ہاں بھی یہ رواج رہا ہے کہ آدمی کی نسل لڑکی سے نہیں چلتی بلکہ لڑکے سے چلتی ہے، بالفرض سیدہ فاطمہ رضی اللہ عنہا کی اولاد کے متعلق مان لیجیے کہ وہ آل محمد ہیں لیکن بنی ہاشم کے پورے خاندان کو کس طریقہ سے آل محمد ہونے کا شرف حاصل ہو جاتا ہے؟ صاف معلوم ہوتا ہے کہ یہ روایت صرف بنی ہاشم کا سر اونچا کرنے کے لئے گھڑی گئی ہے، ورنہ اس کی کوئی بنیاد نہیں۔

یہاں یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ آل محمد میں اگر کچھ لوگ فی الواقع محتاج ہوں اور ان کے پاس زندگی گذارنے کے وسائل موجود نہ ہوں تو کیا ان کو بھوکے مرنے دیا جائے گا اور صدقہ سے ان کی مدد نہیں کی جائے گی۔ اگر اس مدد کے لئے کوئی حیلے تراشے جاتے ہیں تو اس سے حقیقت تو نہیں بدل جائے گی، اس صورت میں بھی ان کا ہاتھ تو نیچے ہی رہے گا۔" (ص ۵۲۷، ۵۲۸)

مولانا حسن پائے کے عالم تھے ان کے نئے اشخاص پر تنقید نا روا نہیں کہ نحن رجال و ہم رجال مگر الفاظ کے استعمال اور انداز بیان میں ان سے یقیناً بے احتیاطی ہوئی ہے اور وہ حمایت حق کے جوش میں اپنے غیظ و غضب پر قابو نہیں رکھ سکے ہیں جس کے نمونے اوپر کے اقتباسات میں دیکھے جا سکتے ہیں مزید چند مثالیں اور ملاحظہ ہوں:

"گویا امام مالک سندوں کو اہمیت نہیں دیتے بلکہ بات کو اہمیت دیتے ہیں اس لئے کہ سندوں میں ہیر پھیر کرنے جانے کیا کیا زہر دیا جاتا ہے۔" (ص ۵۳۶)

"ابن شہاب کے متعلق زرقانی کا تبصرہ یہ ہے کہ ان کے تدین کی موج ہے وہ جس روایت کو

چاہتے ہیں مرسل چھوڑ دیتے ہیں اور جس کو چاہتے ہیں موصول کر لیتے ہیں۔" (ص ۲۱۵)

"یہ بدمعاشی ہے۔" (ص ۳۱۵)

"حضرت عمرؓ جیسے معقول، مہذب اور شائستہ آدمی سے یہ بات بالکل بعید ہے کہ وہ حق یا ناحق ہر موقع پر لوگوں کی ٹھکائی کر دیتے رہے ہوں یقیناً لوگوں کو موقع و محل سمجھنے میں غلطی ہوئی ہے۔" (ص ۱۵۳)

اس طرح کے رکیک الفاظ اور مبتذل انداز بیان مولانا کے منصب سے فروتر، کسی علمی، شائستہ اور سنجیدہ تحریر کے لئے نازیبا اور ایسی باوقار تصنیف کے لئے داغ دھبہ ہے۔

اس کتاب سے حدیث میں تفکر و تدبر کی صلاحیت پیدا ہوتی ہے اور یہ اہل علم کو حدیث کے فہم و مطالعہ کا ایک نیا نہج عطا کرتی ہے، لیکن حدیث کے درس و مطالعہ کے عام اور مروج طریقوں کے پابند حضرات کے لئے ممکن ہے کہ اس میں بعض چیزیں بے اطمینانی کی ہوں، تاہم اس کا مطالعہ ان کے لئے فائدے سے خالی نہیں اور جو لوگ اس انداز و نہج کو پسند کرتے اور اسے صحیح سمجھتے ہیں ان کے لئے یہ شرح نہایت بیش قیمت ہے۔ شروع میں ادارہ تدبر قرآن و حدیث کے ڈائرکٹر نے مصنف و شارح کا مختصر تذکرہ اور موطا اور اس کی شرح کی خصوصیات قلم بند کی ہیں۔

ششماہی علوم القرآن مولانا امین احسن اصلاحی نمبر — مرتبہ ڈاکٹر اشتیاق احمد ظلی و ڈاکٹر ظفر الاسلام اصلاحی، متوسط تقطیع، کتابت کمپیوٹر، کاغذ و طباعت عمدہ، صفحات ۴۰۰، سالانہ چندہ ۴۰ روپے، اس شمارے کی قیمت ۱۵۰ روپے، پتہ: ادارہ علوم القرآن پوسٹ باکس نمبر ۹۹، سر سید نگر، علی گڑھ

مولانا امین احسن اصلاحی کی عمر عزیز دین اور علم دین کی خدمت میں گزری، قرآن مجید اور احادیث نبوی سے انہوں نے بڑا سروکار رکھا اور ان میں غور و خوض کا ایک خاص معیار اور نہج قائم کیا اس لئے

ششماہی علوم القرآن نے جو قرآن مجید ہی سے متعلق مضامین کی اشاعت کے لیے مختص ہوتا ہے قرآن مجید کے اس خادم کی یاد میں یہ خاص نمبر شایع کیا ہے، اس کے ابتدائی حصے کے مضامین مولانا کی تفسیر تدبر قرآن کے جائزے پر مشتمل ہیں، ان سے اس تفسیر کے مزایا و خصوصیات اور مولانا کے منفرد انداز تفسیر کا پتہ چلتا ہے، جناب الطاف احمد نے تفسیر کو منفرد قرار دیتے ہوئے اس کی خوبیوں اور خرابیوں کے ذکر میں علمی سے زیادہ تحکمانہ انداز اختیار کیا ہے اور حکم لگانے میں غور و فکر کے بجائے عجلت سے کام لیا ہے، مولانا اصلاحی کی تفسیر کا اصول و نہج وہی ہے جو مولانا فراہی کا تھا، یہ تو کہا جاسکتا ہے کہ وہ اس نہج کو خاطر خواہ طور پر قائم نہیں رکھ سکے اور بعض بعض جگہ ان کی رائے سے اختلاف کیا یا اس پر مزید اضافہ کیا لیکن اس کے لیے غیر فراہی عناصر کی تعبیر بہت عجیب اور نامناسب ہے، مولانا فراہی نے قرآن مجید کی مکمل تفسیر نہیں لکھی اس لیے مضمون نگار کا ان کے حواشی کو بنیاد بنانا درست نہیں کیونکہ ان میں سے بعض سے محشی نے بعد میں رجوع کیا تھا، مولوی نعیم الدین صاحب کا مضمون مدرسانہ تنقید کا نمونہ ہے، چند مضامین میں مولانا کی تصانیف پر تبصرہ کیا گیا اور ان کے مشمولات کا جائزہ لیا گیا ہے، مولانا کی خدمت حدیث پر ایک ہی مضمون ہے جو بہت اچھا ہے، صفدر سلطان صاحب کا مضمون مولانا کی تحریکی خدمات پر سیر حاصل اور حقیقت پسندانہ ہے جو بڑی تلاش و محنت سے لکھا گیا ہے، مولانا کے اسلوب نگارش پر الیاس صاحب کا مضمون بھی اچھا ہے، آخر میں مولانا سے متعلق تاثراتی مضامین اور تحریریں، ان سے لیا گیا ایک انٹرویو اور ان کے بارے میں ان کے بھتیجے پروفیسر اشتیاق احمد کا انٹرویو ہے مولانا کی تصنیفات اور ان پر لکھے گئے مضامین اور تحریروں کے دو اشاریے بھی ہیں جو ڈاکٹر ظفر الاسلام کی سعی و محنت کا نتیجہ ہیں، ان کے قلم سے ایک اور اچھا مضمون ڈاکٹر حفیظ اللہ اور مولانا اصلاحی بھی شامل ہے، اس کے ایک حاشیے میں شبیر احسن کی تعیین میں ان سے فروگزاشت ہوگئی ہے، یہ ڈاکٹر صاحب کے بھانجے نہیں مولانا اصلاحی کے چھوٹے بھائی مولوی شبیر احسن اصلاحی مرحوم تھے جو مدرسۃ الاصلاح سے فراغت کے بعد چند برس اعظم گڑھ میں رہے اور ان کی رہایش ڈاکٹر صاحب کے بنگلہ پر تھی، فاضل مدیر کا اداریہ پر مغز اور مطلب خیز ہے، یہ خاص نمبر قدر و قیمت کا حامل ہے، اس کی اشاعت میں گو تاخیر ہوئی مگر یہ دیر آید درست آید کے مصداق ہے۔

مطبوعات جدیدہ

مخزن فوائد از نیاز علی بیگ نکہت دہلوی، مرتبہ ڈاکٹر محمد ذاکر حسین، متوسط تقطیع عمدہ کاغذ و طباعت، صفحات ۵۸۴، قیمت ۲۰۰ روپے، پتہ: خدا بخش اورینٹل پبلک لائبریری پٹنہ ۴۔

اردو کی اس قدیم فرہنگ کا امتیاز یہ ہے کہ پہلی بار اس میں تفصیل سے اصطلاحوں، محاوروں اور ضرب المثلوں کو یکجا کرکے اساتذہ کے کلام سے سند و نظیر کا التزام کیا گیا تھا، شاہ نصیر کے شاگرد نیاز علی بیگ نکہت کی یہ تالیف ۱۸۴۵ء میں طبع ہوئی لیکن قریب ڈیڑھ سو سال کے عرصے تک یہ طبع ثانی سے محروم رہی، حالانکہ اس عرصے میں شایع ہونے والی اور فرہنگوں اور لغات کا خاص ماخذ و مرجع رہی، لیکن خود یہ مخزن نایاب تھا، خدا بخش لائبریری نے ۲۲۰۰ الفاظ کے اس مخزن کو دریافت اور اس کے فوائد کو عام کرکے یقیناً بڑا قابل قدر کارنامہ انجام دیا ہے، لائبریری کے لائق رفیق نے انجمن ترقی اردو پاکستان کے مملوکہ نسخے اور خود خدا بخش لائبریری میں محفوظ لغت محاورات اردو کی مدد سے سخت محنت و ریاضت کے بعد اس کو اور زیادہ مفید بنادیا، بعض الفاظ کی سند و نظیر اصل نسخے میں موجود نہ تھی، لائق مرتب نے اس کمی کو خوبی سے پورا کردیا ہے، شروع میں انہوں نے کتاب، مولف، خصائص و نقائص، ماخذ و مصادر اور طریقہ تالیف پر عالمانہ تحریر سپرد قلم کی ہے، جس میں مخزن فوائد اور فرہنگ آصفیہ کی بعض اسناد، تشریحات حتیٰ کہ اغلاط میں مطابقت اور یکسانی کی بحث بڑی دلچسپ ہے، ان کی نظر میں صاحب فرہنگ آصفیہ اس میں واضح طور پر سرقے کے مرتکب ہوئے ہیں۔ آخر میں تمام الفاظ کی

الفبائی فہرست نے افادیت و سہولت کو دو چند کر دیا ہے۔

پروفیسر خواجہ احمد فاروقی از جناب پروفیسر خلیق انجم، متوسط تقطیع، بہترین کاغذ و کتابت و طباعت، مجلد مع گرد پوش، صفحات ۱۰۵، قیمت ۱۰۰ روپے پتہ: انجمن ترقی اردو ہند، اردو گھر، ۲۱۲، راؤز ایونیو، نئی دہلی۔

تحقیق و تنقید، خطوط و خاکہ نگاری میں پروفیسر خواجہ احمد فاروقی کا شمار صف اول کے اہل قلم میں ہوتا ہے، شائستہ، پاکیزہ اور شگفتہ اسلوب ان کا نمایاں وصف ہے، دلی یونیورسٹی بلکہ ہندوستان کی اکثر جامعات میں اردو کی اعلیٰ تعلیم و تدریس کے لئے ان کی جد و جہد کی اہمیت کا علم کم لوگوں کو ہے، شاید اسی لئے اس باب میں ان کا کما حقہ اعتراف نہیں کیا گیا، دلی کالج اور دلی یونیورسٹی کے شعبہ اردو کی داستان خواجہ صاحب مرحوم کی جگر کاویوں سے رنگین و روشن ہے، زیر نظر کتاب ان کی طرحدار، البیلی اور صاحب طرز ادبی شخصیت کے متعلق ایک مختصر توسیعی خطبہ ہے، لیکن اس میں بڑی جامعیت سے ان کی زندگی اور اس کے احصل کا عطر کشید کر لیا گیا ہے، فاضل خطبہ نگار کو خواجہ صاحب سے شرف تلمذ کے علاوہ برسوں کی رفاقت و معیت کی سعادت بھی حاصل رہی ہے، اس لئے ان کے قلم میں محبت و عقیدت کی سرشاری کے ساتھ مشاہدہ کی واقعیت و صداقت بھی شامل ہے، ذیلی عنوانوں کے تحت خواجہ صاحب کی ادبی زندگی کے مختلف گوشوں سے بحث ہے، لیکن شعبہ اردو کے ذمہ دار ہونے کی حیثیت سے ان کی علمی سرگرمیوں کی داستان سب سے بڑھ کر ہے جس سے ان کی شخصی عظمت کا اندازہ ہوتا ہے، فاضل مصنف کے الفاظ میں "خواجہ صاحب کی پوری زندگی یہ شعبہ اردو ہی تھا"۔ فاروقی صاحب کی زندگی اور ادبی خدمات کسی مفصل حیات فاروقی کی متقاضی ہیں، جس کے لئے یہ مختصر توسیعی خطبہ نقش اول ہونے کے باوجود چراغ راہ ثابت ہو سکتا ہے۔

علی جواد زیدی، حیات شخصیت اور فن از جناب عبدالرحمن انصاری عزم متوسط تقطیع، عمدہ کاغذ و طباعت، مجلد مع گرد پوش، صفحات ۲۹۹، قیمت ۲۰۰ روپے

پتہ: حسامی بک ڈپو، مچھلی کمان، حیدرآباد، اے۔ پی۔

گذشتہ صدی کے نصف آخر میں اردو کے آسمان علم و ادب پر جن سیاروں اور ستاروں کی تابانی مسلسل قائم و افزوں رہی ان میں ایک نام علی جواد زیدی کا بھی ہے، تاریخ، تنقید، تحقیق، ترجمہ و خاکہ نگاری اور سب سے بڑھ کر شاعری کے ذریعہ وہ پرورش لوح و قلم میں مصروف ہیں، ان کی ادبی زندگی کا آغاز ترقی پسند تحریک سے اثر پذیری اور وابستگی سے ہوا لیکن اعلیٰ علمی و ادبی ذوق نے ان کو ہمیشہ اعتدال و توازن کی راہ پر گامزن رکھا، مختلف اصناف ادب میں ان کی پچاس سے زائد کتابیں ہیں، جن میں نظموں اور غزلوں کے مجموعوں کے علاوہ قصیدہ و مثنوی و مرثیہ نگاری اور سب سے بڑھ کر نعت نگاری ہے، ان کی کتابیں اس صداقت پر شاہد ہیں کہ وہ ان ترقی پسند ادیبوں میں ہیں جنہوں نے کسی خاص سیاسی مسلک، علامت، نعرے اور اشتہاری ادب سے جدا اپنی علمی و ادبی کاوشوں کی بنیاد اپنے تجربات و مشاہدات اور فنی جگر کاوی پر رکھی، زیر نظر کتاب ان کی سنجیدہ، شائستہ، ذہین اور متین شخصیت کے حالات اور علمی کمالات کی جامع اور دلکش تصویر ہے، فاضل مولف کا سلیقہ تالیف بھی نمایاں ہے، انہوں نے مختلف عنوانوں کے تحت اپنے ممدوح کی کتابوں کے جامع تعارف کے علاوہ ان کی تمام مطبوعہ و غیر مطبوعہ تحریروں کی فہرست بھی تیار کر دی، زیدی صاحب بلکہ ترقی پسند تحریک کے متعلق دوسرے محققین کے لئے یہ کتاب ایک مستند ماخذ کی شان رکھتی ہے۔

قافلہ ادب اسلامی مرتب ڈاکٹر محمود الحسن عارف، متوسط تقطیع، عمدہ کاغذ

وطباعت، مجلد، صفحات ۴۰۴، قیمت ۲۰۰ روپے، پتہ: صدر شعبہ اردو دائرہ معارف اسلامیہ، پنجاب یونیورسٹی لاہور، پاکستان۔

حرمین شریفین کے سفرنامے اردو زبان میں ایک مستقل اور پاکیزہ صنف ادب کی حیثیت کے حامل ہیں، لیکن خالص مذہبی وصف کی بنا پر شاید ان کی ادبی اہمیت کا اظہار واعتراف کم کیا گیا، رابطہ ادب اسلامی کے اسی کوتاہی کے پیش نظر پاکستان میں اپنے اولین سمینار کے لئے اس موضوع کا انتخاب کیا، ۱۹۹۷ء میں لاہور میں یہ بین الاقوامی سمینار موضوع کے شایان شان منعقد ہوا، اس وقت کے پاکستان کے صدر جناب فاروق لغاری اور عالمی رابطہ ادب اسلامی کے صدر مولانا سید ابوالحسن علی ندویؒ اور متعدد ممتاز علما و ادبا اس میں شریک ہوئے، برصغیر کی نمائندگی قدرتاً زیادہ تھی، زیر نظر کتاب اسی سمینار کے مقالات کا انتخاب ہے ان میں تین عربی زبان میں ہیں، باقی کو سفرناموں کے ابتدائی دور اور فارسی اور اردو سفرناموں کے ابواب کے تحت یکجا کیا گیا ہے، شیخ عبدالحق محدث دہلویؒ شاہ ولی اللہ دہلویؒ اور نواب سید صدیق حسنؒ خاں کے سفرنامے پر از معلومات ہیں، نواب شیفتہ نے مومن کے نام ایک خط میں اپنے سفر حج کی روداد لکھی تھی یہ تحریر اب تک طبع نہیں ہوئی تھی، ڈاکٹر نثار احمد فاروقی نے اس نادر خط کا تعارف کرایا ہے، موضوع سے متعلق دو مفصل اور جامع مضامین ڈاکٹر محمود الحسن عارف اور پروفیسر لیسین مظہر صدیقی کے قلم سے ہیں، علامہ اقبال کے روحانی سفرنامہ ارمغان حجاز کے منازل و مقامات کی تفصیل بھی بڑی دلکش ہے، حج کے سفرنامے جدید تحریکات کے تناظر میں اصل موضوع تھا، لیکن عنوان کے دوسرے پہلو سے کم بحث کی گئی ہے، کمپیوٹر کی کتابت میں جابجا غلطیاں ہیں، مولانا سید محمد رابع کو مولانا علی میاںؒ کا نواسہ لکھا گیا ہے، اور پروفیسر اجتباء

ندوی کو اجتبی ندوی لکھ دیا گیا ہے۔

فارسی ادب کا مطالعہ از ڈاکٹر رفیعہ شبنم عابدی، متوسط تقطیع، عمدہ کاغذ و طباعت، مجلد، صفحات ۱۶۸، قیمت ۱۰۰ روپے، پتہ: مکتبہ فاران، ۴۴-اے، محمد علی روڈ، نزد نور ہاسپٹل، ممبئی اور مکتبہ جامعہ لمیٹڈ، ممبئی، دہلی، علی گڑھ۔

زیر نظر کتاب بھی ادب اسلامی کے فروغ و اشاعت کی ایک کڑی ہے، ایران میں علامہ خمینی کے انقلاب اسلامی کے بعد سیاست اور تہذیب و ثقافت کو مغرب کے مادی اور بے راہ افکار اور اعلیٰ انسانی اخلاق سے عاری خیالات سے پاک کرنے کی مہم شد و مد سے شروع کی گئی، یہ مجموعہ مضامین بھی انقلاب اسلامی کی سالگرہ کے موقع پر ایک سمینار کی یادگار ہے جس میں جدید اسلامی ایران کے فارسی شعر و ادب کی انقلابی تبدیلیوں، خوبیوں اور کمزوریوں کا جائزہ وہاں کے ممتاز ادیبوں مثلاً ڈاکٹر احمد احمدی، ڈاکٹر منوچہر اکبری، ڈاکٹر مصطفی اولیائی، مہدی رستگار اور محمد باقر نجف زادہ وغیرہ نے لیا ان میں فارسی ادب کا سرچشمہ انقلاب نو کی شاعری اور ادبیات انقلاب اسلامی کے لسانی اور اسلوبی عناصر خاص طور پر قابل ذکر ہیں، ایک مضمون میں علامہ اقبال کی شاعری کے اثرات کے جائزہ میں کہا گیا کہ ایرانی انقلاب کے دور میں اقبال کے اشعار تمام ایران کی زبان پر تھے، مقالات کا ترجمہ عمدہ اور رواں ہے تاہم کہیں کہیں ترجمہ پن کا احساس بھی ہوتا ہے مثلاً ”موجودہ نشر و اشاعت کے پیش نظر ان دس سالوں میں دوبارہ اپنی اصالت اور حرمت حاصل کر چکی ہے، بعض تعبیروں کی وضاحت زیادہ بہتر ہوتی مثلاً انقلاب مشروطیت، دائمی عینیتوں، معمائی ایجازی شاعری وغیرہ، سوریالزم، سیاسی تنالزم جیسی اصطلاحات عام اردو دانوں کے لئے مشکل اور ناقابل فہم ہیں، اسی طرح کیری کلچر

اور کیری کلما چر کی اردو اصطلاحات کا استعمال بہتر ہوتا، فارسی اشعار بھی بغیر ترجمے کے ہیں۔

مجموعہ مضامین از جناب مولانا حبیب ریحان خاں ندوی ازہری، متوسط تقطیع، کاغذ و طباعت عمدہ، مجلد، صفحات ۱۴۶، قیمت ۱۰۰ روپئے پتہ: دار التصنیف و الترجمہ، ۲۰، رفیقیہ اسکول روڈ بھوپال ایم۔پی۔

اس کتاب کے فاضل مصنف کی کئی کتابوں کا ذکر ان صفحات میں آچکا ہے، وہ ایک مشاق پختہ فکر وسیع المطالعہ اور زود نویس اہل قلم ہیں، لیبیا میں ایک طویل عرصے کے قیام کے بعد اپنے آبائی شہر بھوپال میں علم و تحقیق کی دنیا آباد کئے ہوئے ہیں، برسوں پہلے ان کے برادر خورد جناب رضوان خاں ندوی مرحوم نے بھوپال ٹائمز کے نام سے ایک اخبار جاری کیا تھا، اخبار گو جلد ہی بند ہو گیا لیکن قلیل مدت میں اس نے معیاری صحافت کا اچھا نمونہ پیش کیا، اس میں فاضل مصنف کی تحریروں کا بھی بڑا دخل رہا جو مختلف النوع موضوعات مثلاً مذہبی عقائد، معاشرتی فساد، سیاسی مسائل وغیرہ پر مشتمل تھیں، زیر نظر کتاب اسی اخبار کی تحریروں کا انتخاب ہے جس میں ابن حزم کے عقیدۂ توحید سے یونان کے اولمپک کھیلوں اور مجروح سلطانپوری کی شاعری تک اظہار خیال کیا گیا ہے، صحافت کے وقتی تقاضوں کے باوجود ان تحریروں کی افادیت اب بھی قائم ہے۔

نظم سمندر از جناب کالی داس گپتا رضا، مرتب جناب عبداللہ کمال، متوسط تقطیع، کاغذ، کتابت و طباعت عمدہ، صفحات ۳۰۳، قیمت ۱۰۰ روپئے، ساکار پبلشرز پرائیوٹ لمیٹڈ، ۱۰، نیو مرین لائنز بمبئی۔۲۰۔

اس مجموعہ کلام کے شاعر کی اصل شہرت ادیب و محقق اور ماہر غالبیات کی ہے لیکن شعر گوئی میں بھی ان کو کمال حاصل تھا، انہوں نے مختلف اصناف شعر میں داد سخن دی، افسوس کہ گذشتہ دنوں وہ راہی عدم ہوئے، زیر نظر مجموعہ ان کی بعض مطبوعہ اور غیر مطبوعہ نظموں پر مشتمل ہے جس کو ان کے ایک سخن شناس قدرداں نے اس مقصد سے مرتب کیا کہ ہمارے ادب کو ایسی نظموں کی ضرورت ہے جو صرف انسان کی زندگی کے حزن و نشاط کے لئے وقف ہوں، نصف صدی پر محیط اس شاعری کا نقطۂ عروج نظم لاشعور سے شعور تک ہے جس میں زندگی اور موت کا فلسفہ بہت خوب ہے، پیش لفظ میں ان کی شاعری کا متوازن تجزیہ کیا گیا ہے۔

ع۔ص۔

تصانیف مولانا عبد السلام ندوی مرحوم

☆ اسوۂ صحابہؓ: (حصہ اول) اس میں صحابہ کرامؓ کے عقائد، عبادات، اخلاق و معاشرت کی تصویر پیش کی گئی ہے۔ قیمت ۵۰/روپے

☆ اسوۂ صحابہؓ: (حصہ دوم) اس میں صحابہ کرامؓ کے سیاسی، انتظامی اور علمی کارناموں کی تفصیل دی گئی ہے۔ قیمت ۵۶/روپے

☆ اسوۂ صحابیاتؓ: اس میں صحابیات کے مذہبی، اخلاقی اور علمی کارناموں کو یکجا کر دیا گیا ہے۔ قیمت ۲۰/روپے

☆ سیرت عمر بن عبد العزیز: اس میں حضرت عمر بن عبد العزیز کی مفصل سوانح اور ان کے تجدیدی کارناموں کا ذکر ہے۔ قیمت ۳۲/روپے

☆ امام رازی: امام فخر الدین رازی کے حالات زندگی اور ان کے نظریات و خیالات کی مفصل تشریح کی گئی ہے۔ قیمت ۳۵/روپے

☆ حکمائے اسلام: (حصہ اول) اس میں یونانی فلسفہ کے مآخذ، مسلمانوں میں علوم عقلیہ کی اشاعت اور پانچویں صدی تک کے اکابر حکمائے اسلام کے حالات، علمی خدمات اور فلسفیانہ نظریات کی تفصیل ہے۔ قیمت ۵۰/روپے

☆ حکمائے اسلام: (حصہ دوم) متوسطین و متاخرین حکمائے اسلام کے حالات پر مشتمل ہے۔ قیمت ۳۰/روپے

☆ شعر الہند: (حصہ اول) قدماء سے دور جدید تک کی اردو شاعری کے تغیر کی تفصیل اور ہر دور کے مشہور اساتذہ کے کلام کا باہم موازنہ۔ قیمت ۹۳/روپے

☆ شعر الہند: (حصہ دوم) اردو شاعری کے تمام اصناف غزل، قصیدہ، مثنوی اور مرثیہ وغیرہ پر تاریخی و ادبی حیثیت سے تنقید کی گئی ہے۔ قیمت ۵۰/روپے

☆ اقبال کامل: ڈاکٹر اقبال کی مفصل سوانح اور ان کے فلسفیانہ و شاعرانہ کارناموں کی تفصیل کی گئی ہے۔ قیمت ۸۰/روپے

☆ تاریخ فقہ اسلامی: تاریخ التشریع الاسلامی کا ترجمہ جس میں فقہ اسلامی کے ہر دور کی خصوصیات ذکر کی گئی ہیں۔ قیمت ۳۵/روپے

☆ انقلاب الامم: سر تطور الامم کا انشاء پردازانہ ترجمہ۔ قیمت ۵۵/روپے

☆ مقالات عبد السلام: مولانا مرحوم کے اہم ادبی و تنقیدی مضامین کا مجموعہ۔ قیمت ۱۴۰/روپے